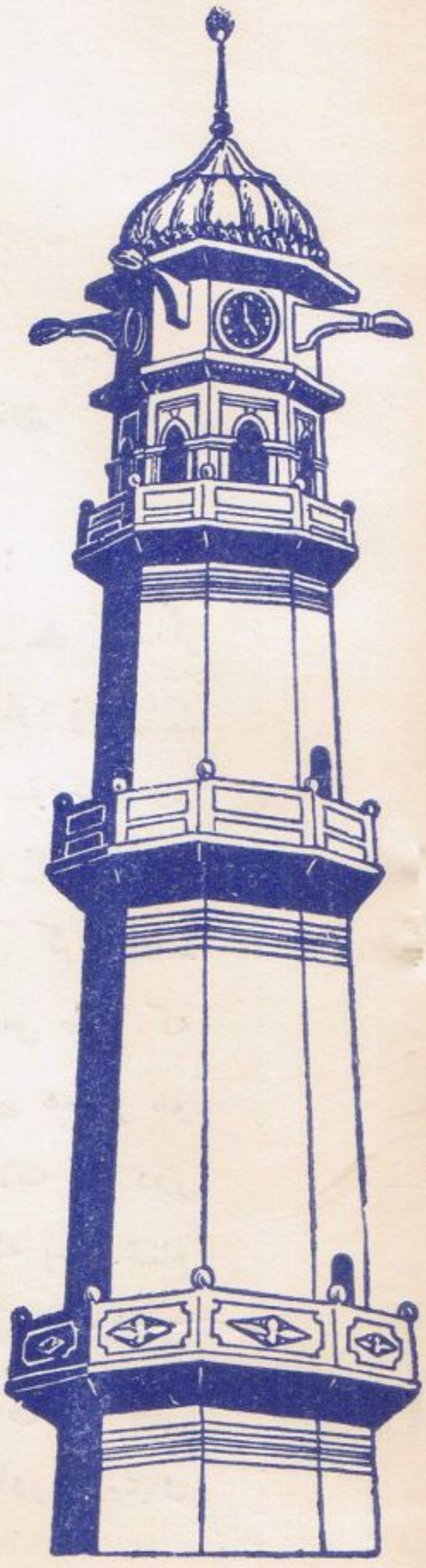

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

المنار

شہادت - ہجرت - احسان ۱۳۴۸ ہجری شمسی

اپریل - مئی - جون ۱۹۶۹ عیسوی

معارف القرآن

لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرایتہ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ

اس آیت کی تفسیر میں حضرت اقدس مسیح موعود نے فرمایا :-

''ایک تو اس کے یہ معنے ھیں کہ قرآن شریف کی ایسی تاثیر ھے کہ اگر پہاڑ پر وہ اترتا تو پہاڑ خوف خدا سے ٹکڑے ٹکڑے ھو جاتا - اور زمین کے ساتھ مل جاتا جب جمادات پر اس کی ایسی تاثیر ھے - تو بڑے ھی بےوقوف وہ لوگ ھیں جو اس کی تاثیر سے فائدہ نہیں اٹھاتے - اور دوسرے اس کے معنی یہ ھیں - کہ کوئی شخص محبت الہی اور رضائے الہی کو حاصل نہیں کر سکتا - جب تک دو صفتیں اس میں پیدا نہ ھو جائیں - اول تکبر کو توڑنا جس طرح کہ کھڑا ھؤا پہاڑ جس نے سر اونچا کیا ھؤا ھوتا ھے - گر کر زمین سے ھموار ھو جائے اسی طرح انسان کو چاھئیے کہ تمام تکبر اور برائی کے خیالات کو دور کرے عاجزی اور خاکساری کو اختیار کرے اور دوسرا یہ ھے کہ پہلے تمام تعلقات اس کے ٹوٹ جائیں جیسا کہ پہاڑ گر کر متصدعاً ھو جاتا ھے - اینٹ سے اینٹ جدا ھو جاتی ھے - ایسا ھی اس کے پہلے تعلقات جو موجب گندگی اور الہی نارضامندی تھے وہ سب تعلقات ٹوٹ جائیں - اور اب اس کی ملاقاتیں اور دوستیاں اور محبتیں اور عداوتیں صرف اللہ تعالی کے لئے رہ جائیں ''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور رفعت کا نشان

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

شمارہ نمبر ۲ | اپریل مئی۔ جون ۱۹۶۹ء | جلد نمبر ۱۹

المنار

نگران

پروفیسر رفیق احمد ثاقب۔ ایم ایس سی

(مدیر اعلیٰ)

حافظ عباس علی عاصم

مدیر

مبارک احمد طاہر

نائب مدیر

عبدالکریم خالد

ترتیب

- اداریہ
- تبرکات
- گورکن (افسانہ)
- آپ فارغ وقت کیسے گزارتے ہیں (ایک جائزہ)
- غزلیات
- انیس کے نام (ایک خط)
- اِدھر اُدھر سے
- طول شب فراق ذرا آپ دیکھئے ۔ مرزا حیا ادیب
- آنسو

(حمید ہاشمی پبلشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ سے چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ ضلع جھنگ سے شائع کیا)

اداریہ

قانون قدرت تو یہ ہے کہ اشیاء گرمیوں میں پھیلیں اور سردیوں میں سکڑیں۔ لیکن ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ یہ قانون المنار پر کیوں لاگو نہیں ہو سکا۔ آپ تیس صفحات کا المنار دیکھ کر ضرور حیران ہوں گے۔ آپ کی حیرانی بجا ہے۔ لیکن کیا کیجئے۔ اگر وسائل کی دیوار راہ میں حائل نہ ہوتی تو ہم حسب سابق آپ کو سو ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل المنار دیتے۔ بہر حال ان صفحات کو ہی غنیمت جانئے۔

نہ جانے کیسے ہمارے بعض ساتھیوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ ہم ان کے مضامین عمداً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حاشا وکلا ہم ایسا نہیں کرتے۔ ہم تو ہر اچھی اور معیاری تخلیق کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں۔ آپ بھی المنار کے معیار کے مطابق مضمون لکھئے ہم اسے بخوشی المنار میں حسب گنجائش جگہ دیں گے۔ یہ گنجائش کا مسئلہ بھی اب نہایت اہم اور قابل لحاظ بن چکا ہے۔ اب اسی شمارے کو لیجئے صرف تیس صفحات ہمیں میسر ہیں اور بعض ہمارے لکھاری ایسے ہیں جو کسی صورت میں بیس صفحات سے کم کا مضمون لکھنے کو تیار ہی نہیں۔ بات اگر لکھنے لکھانے تک ہی محدود ہوتی تو بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے بھی آگے گزر چکا ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا مضمون یا غزل من وعن چھپے۔ اس میں کسی قسم کا ردو بدل یا اصلاح نہ ہو۔ نیز اس کے مضمون یا غزل کو دوسروں کی نگارشات پر ترجیح دی جائے ایسی صورت میں ہماری مجبوری مسلّم ہے۔

ہمارے لئے ایک اور وجہ پریشانی یہ بھی ہے کہ بعض طلباء دوسروں کی نگارشات چرا کر المنار میں اشاعت کیلئے بھجوا دیتے ہیں۔ ہم اپنے علم اور فہم کے مطابق ایسی تخلیقات کو اشاعت سے روک دیتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات طلباء ہماری لاعلمی اور کم مائیگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پچھلے شمارے میں اسی طرح ہوا۔ ایک طالب نے مسروقہ نظم بھجوائی اور ہماری لاعلمی کی بناء پر چھپ گئی۔ اشاعت کے بعد ان کا پول کھلا۔ ادارہ اس پر قارئین المنار سے معذرت خواہ ہے۔ آئندہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جو بھی اس قسم کی حرکت کا مرتکب ہوا اس سے کالج کی طرف سے باز پرس کی جائے اور اس سے کسی قسم کی رعایت نہ برتی جائے۔ کیونکہ یہ کالج کے وقار کا مسئلہ ہے۔ ان معدودے چند گندی مچھلیوں کو کسی صورت میں بھی صاف وشفاف پانی سے بھرے ہوئے تالاب کو گندا کر دینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

گزشتہ ماہ کالج کے دو واجب الاحترام اساتذہ جناب پروفیسر عبدالشکور صاحب اسلم ایم۔ایس سی استاد شعبہ حیاتیات اور جناب پروفیسر شیخ محبوب عالم صاحب خالد ایم۔اے صدر شعبہ اردو کے اعزاز میں الوداعی تقاریب عمل میں لائی گئیں۔ مکرم عبدالشکور صاحب اسلم ۲۲ مارچ ۱۹۶۹ء کو ربوہ سے سیرالیون روانہ ہوئے۔ آپ وہاں جماعت احمدیہ کے ایک تعلیمی ادارے میں استاد کی حیثیت سے خدمات بجا لائیں گے۔ جناب شیخ محبوب عالم صاحب خالد مسلسل ۲۲ برس تک ہمارے کالج میں درس وتدریس کی خدمات بجا لانے کے بعد ریٹائر ہو گئے۔ آپ نے جس محنت اور تندہی سے کام کیا وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ کی شخصیت نظم وضبط کا بہترین نمونہ رہی۔ درس وتدریس کے علاوہ آپ کالج سے متعلق امور بھی نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے۔ آپ لمبا سال تک المنار کے حصہ اردو کے نگران رہ چکے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان خدمات کا احسن بدلہ دے۔ اور آئندہ بھی جماعتی سرگرمیوں میں تندہی سے حصہ لینے کی توفیق وافر عطا فرمائے۔

جولائی اور اگست کے مہینے نہایت کٹھن ہوتے ہیں۔ ان ایام میں ایک تو گرمی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ دوسرے رہی سہی کمی امتحان پوری کر دیتے ہیں۔ بہرحال امتحان دینے والے طلبہ سے ہمیں پوری پوری ہمدردی ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خدا تعالیٰ انہیں اعلیٰ کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار کرے تاکہ وہ تعلیم سے فراغت کے بعد قوم وملت کی بہترین خدمات سرانجام دے سکیں۔

اب تو شاید موسم گرما کی تعطیلات کے بعد ہی ملاقات ہوگی۔ اس وقت تک کے لئے اجازت چاہتے ہیں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو تعطیلات کے بعد آپ کی خدمت کے لئے دوبارہ حاضر ہو جائیں گے۔

(ادارہ)

تبرکات

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

از قلم حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔

انسانی دماغ بھی اللہ تعالیٰ نے عجیب قسم کا بنایا ہے۔ کئی کئی حالتوں میں سے وہ گذرتا ہے۔ ایک وقت فلسفہ کے وہ مسئلے الجھا رہے ہوتے ہیں تو دوسرے وقت وجدان کی ہوائیں اُسے اڑا رہی ہوتی ہیں۔ ایک وقت علم کے خواص اسے نیچے کی طرف کھینچ رہے ہوتے ہیں تو دوسرے وقت عشق کی بلندیاں اُسے اُوپر کو اٹھا رہی ہوتی ہیں۔ انہی حالتوں میں سے ایک، حالت مجھ پر طاری تھی۔ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر غور کر رہا تھا۔ میری عقل اس کی حد بندی کرنا چاہتی تھی کہ میرا دل میرے ہاتھوں سے نکلنے لگا۔ اس بحرِ ناپیدا کنار کی شناوری نے میری فکر کو سب قیود سے آزاد کر دیا۔ اور وہ زمانہ اور مکان کی قید سے آزاد ہو کر اپنی ہمت اور طاقت سے بڑھکر پرواز کرنے لگا۔

آسمان کے لئے رحمت

میری نگاہ آسمانوں کی طرف گئی اور میں نے روشن سورج اور چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھا وہ کیسے خوش منظر تھے۔ وہ کیسے دل لبھانے والے تھے انکی ہر ہر شعاع محبت کی چمک سے درخشاں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جملیوں سے کوئی معشوق محوِ نظارہ ہے۔ میرا دل اس نظارہ کو دیکھکر بیتاب ہوگیا۔ مجھے اس روشنی میں کسی کی صورت نظر آتی تھی کسی ازلی ابدی معشوق کی۔ جو سب حسنوں کی کان ہے۔ مجھ پر بالکل اسی کی سی حالت طاری تھی جس نے کہا ہے ؎

چاند کو کل دیکھ کر میں سخت بیکل ہو گیا
کیونکہ کچھ کچھ تھا فشاں اس میں جمالِ یار کا

نہ معلوم میں اس خیال میں کب تک محو رہتا کہ میں نے عالمِ خیال میں دیکھا۔ سورج کی روشنی زرد۔ دھیمی پڑنے لگی۔ چاند اور ستارے مٹتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ وجود جو ان کی چمک دمک کا باعث تھا۔ ناراض ہو کر پیچھے ہٹ گیا ہے اور جھروکے جھانکنے والے کے چہرہ کے نور سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ زندہ نظر آنیوالے کرّے بے جان مٹی کے ڈھیر نظر آنے لگے۔ میں نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا کہ یہ کیا ہونے لگا ہے؟ کہ میری نظر نیچے کی گہرائیوں میں اپنے ہم جنس انسانوں پر پڑی۔ میں نے دیکھا، ہزاروں لاکھوں بظاہر عقلمند نظر آنیوالے انسان سر کے بل گرے ہوئے یا گھٹنے ٹیک کر بیٹھے ہوئے گڑگڑا گڑگڑا کر اور رو رو کر دعائیں کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ اے سورج دیوتا! مجھ پر نظر کر۔ میرے اندھیرے گھر کو اپنی شعاعوں سے منور کر۔ میری بیوی کی بے اولاد گود کو اولاد سے بھر دے اور میرے دشمنوں کو تباہ کر۔ کوئی کہتا اے چندر ماہا۔ میری تاریکی کی گھڑیوں کو اپنے نور سے روشن کر اور غموں اور رنجوں کو ہمارے گھر سے دُور کر۔ کوئی کہتا۔ اے ستارو! تم خوشیوں کا موجب اور میری راحتوں کا منبع ہو۔ اے زہرہ! تو محبت سے ہمارے گھروں کو بھر دے۔ اور ہمارے پیاروں کے دل ہماری طرف پھیر دے۔ اور اے مریخ! تو ہم پر ناراض نہ ہو۔ اور مصیبتوں کی گھڑیاں ہم پر نہ لا۔ اپنا غصہ ہمارے دشمنوں کی طرف پھیر دے۔

میرا دل اس گھناؤنے نظارہ کو دیکھکر سخت گھبرا گیا! اور میں نے کہا۔ انسان نے کیسی خوبصورت چیزوں کو کیسا گھناؤنا بنا دیا ہے۔ جب عاشق محبوب کے چہرہ کی بجائے اس کی نقاب سے عشق کرنے لگتا ہے۔ جب اس کے حقیقی حسن کو بھلا کر وہ اس کے لباس کی زیبائش پر فریفتہ ہونے لگتا ہے تو محبوب اس لباس سے نکل جاتا ہے اور خالی لباس عاشق کی طرف پھینک دیتا ہے کہ جا اور اسے دیکھا کر۔ مگر وہی لباس جو معشوق

کے جسم پر خوبصورتیوں کا مجموعہ نظر آتا تھا۔ اب کیسا بُرا۔ کیسا بھدّا نظر آتا ہے۔ مَیں نے کہا۔ یہی حال آسمانی اجسام کا ہے۔ جب تک ان میں ازلی ابدی محبوب کا چہرہ دیکھا جائے۔ وہ کیسے خوبصورت نظر آتے ہیں۔ کیسے شاندار۔ کیسے باعظمت۔ اور جب خود ان کی ذات مقصود ہو جائے۔ ان کی عظمت کس طرح برباد ہو جاتی ہے۔ ہیئت دان کس طرح بے رحمی سے ان کو چیر پھاڑ کر ایک دھاتوں کا تودہ ایک گیسوں کا مجموعہ ثابت کر دیتے ہیں۔ مَیں نے اس خیال کے پیدا ہونے پر پہلے تو حسرت سے آسمانوں کی طرف۔ اور ان کے کھوئے ہوئے حُسن کی طرف دیکھا۔ اور پھر انسان اور اُس کی گمشدہ عقل کی طرف نظر کی۔ مَیں اسی حال میں تھا کہ ایک نہایت دلکش نہایت سریلی آواز دل کو مسحور کر دینے والی۔ افکار کو اپنا لینے والی میرے کانوں میں پڑی۔ اُس نے پُر جلال و شاندار لہجہ سے کہا۔ نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو بلکہ صرف اللہ کو جو ایک ہی ہے۔ اور جس کا قبضہ ان سب فلکی اجرام پر اور دوسری چیزوں پر ہے سجدہ کرو۔ اور یاد رکھو کہ اسی نے سورج کو بھی پیدا کیا ہے اور چاند کو بھی۔ اور ستاروں کو بھی۔ اور یہ سب اسی کے ایک ادنیٰ اشارے کے تابع ہیں اور خادم ہیں۔ یاد رکھو کہ وہی پیدا کرنے والا اسی کا حکم چلتا ہے۔

وہ آواز کیسی مؤثر کیسی موہ لینے والی تھی۔ زمین کی حالت یوں معلوم ہوتی جیسے کسی پر قشعریرہ آ جاتا ہے۔ انسان یوں معلوم ہوا۔ جیسے سوتے ہوئے جاگ پڑتے ہیں۔ ندامت۔ شرمندگی اور حیا کیسا تمتماتے ہوئے چہروں کے ساتھ لوگ اُٹھے۔ اور اپنے پیدا کرنے والے کے آگے جھک گئے۔ آسمان پھر خوبصورت نظر آنے لگا۔ ازلی ابدی معشوق نے پھر سورج۔ چاند اور ستاروں کی تجلیوں میں سے دنیا کو جھانکنا شروع کیا۔ پھر دنیا کا ذرّہ ذرّہ جلالِ الٰہی کا مظہر بن گیا۔ ہیئت دانوں کے سب استدلال اور سب دلیلیں حقیر نظر آنے لگیں۔ صاحبِ دل بول اُٹھے۔ تم اپنی گیسوں اور دھاتوں کے نظریوں کو اپنے گھر لے جاؤ۔ تم چھلکے کو تو دیکھتے ہو۔ مغز پر نگاہ نہیں ڈالتے۔ تم ان دھاتوں کے طوماروں اور گیسوں کے مجموعوں کے پیچھے نہیں دیکھتے۔ کس کا حُسن چمک رہا ہے! کس کا ہاتھ کام کر رہا ہے؟ مَیں نے دیکھا۔ چاند کی وہ بے نور سی بھی جسے ہیئت دان کہتے ہیں کہ ہزاروں سال کے تغیرات کے ماتحت مُردہ ہو چکی ہے۔ خوشی سے چمک رہی تھی۔ اسے اس سے کیا کہ وہ سرد ہے یا گرم۔ مردہ ہے یا زندہ۔ اس کا ذرّہ ذرّہ تو اس خوشی سے دمک رہا تھا۔ کہ وہ اب سے آیَةٌ مِّنْ اٰیٰتِ اللّٰه کہلائے گا۔ کسی چیز نے میرے دل میں ایک چٹکی لی۔ اور مَیں نے ایک آہ بھری۔ پھر مَیں نے کہا۔ یہ آواز تو ان اجرامِ فلکی کے لئے ایک رحمت ثابت ہوئی۔

فرشتوں کے لئے رحمت

پھر میری نظر اور بھی بلند ہوئی۔ اور مَیں نے عالمِ خیال میں اُوپر آسمانوں پر ایک مخلوق دیکھی جو نہایت خوبصورت اور نہایت پاکیزہ تھی۔ ان کے چہرے مَیں نے عالمِ کشف اور رؤیا میں دیکھے ہوئے تھے۔ مَیں نے عالمِ خیال میں بھی ان کی ویسی ہی شکل دیکھی اور مجھے نہایت بھولے بھالے وجود نظر آتے۔ لطیف اجسام کے جن کو صرف روحانی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ پاکیزہ صورت اور پاکیزہ سیرت محنتی اور کام کرنے والے۔ ایسے کہ ان کو وقت کے آنے جانے کا کچھ علم ہی نہ ہوتا۔ ان کا ہر لحظہ گویا آقا کی خدمت کے لئے رہن تھا۔ وہ مشینیں تھیں جو مالک کے اشارہ پر چلتی ہیں۔ مگر مَیں نے اپنی فکر کی آنکھ سے دیکھا کہ ان کے خوبصورت چہروں پر افسردگی کے آثار تھے۔ ان کی تازگی میں بھی ایک جھلک پژمردگی کی تھی۔ مَیں نے اس کے سبب کی تلاش کی۔ مگر آسمان پر کوئی بات مجھے نظر نہ آئی۔ جو اس کا موجب ہوتی۔ ان کا آقا ان سے خوش تھا۔ اور وہ اپنے آقا سے خوش۔ پھر ان کی افسردگی کا کیا باعث تھا؟ مَیں نے پھر زمین پر نظر کی اور ایک دل دہلانے والا نظارہ دیکھا۔ مَیں نے بلند عمارتیں دیکھیں جو ان فرمانبرداروں کے نام پر بنائی گئی تھیں۔ مَیں نے ان میں ان کے مجسمے دیکھے جن کی لوگ پوجا کر رہے تھے۔ مَیں نے بھاری بھرکم جسموں والے بڑے بڑے جبّوں والے لوگ دیکھے جو نہایت سنجیدہ شکل بنائے ہوئے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ گویا سب دنیا کا علم سمٹ کر ان کے دماغوں میں جمع ہو گیا ہے۔ اپنے

گرد و پیش بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس لہجہ میں کہ گویا وہ ایک بڑے راز کی بات انہیں بتا رہے ہیں۔ ایسی بات کہ جسے دوسرے لوگ عمر بھر کی جستجو اور بیسیوں سال کی تپسیا کے بعد بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ رہے تھے کہ فرشتے اصل میں خدا کی بیٹیاں ہیں اور جو کام خدا تعالیٰ سے کرانا ہو اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ ان خدا کی بیٹیوں کو قابو میں کیا جائے اور وہ بزعم خود ایسی عبادتیں جن سے فرشتے قابو آتے ہیں لوگوں کو بتا رہے تھے۔ لوگوں کے چہرے خوشی سے جگمگا رہے تھے۔ اور ان کے دل ان علم روحانی کا خزانہ لٹانے والوں پہ قربان ہو رہے تھے۔ پھر میری ایک اور طرف نگاہ پڑی۔ میں نے دیکھا۔ ویسے ہی جبّے ڈالے کچھ اور لوگ اپنے عقیدتمندوں کے جھرمٹ میں ایک کنوئیں کے پاس کھڑے ہوئے کچھ راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ انہیں بتا رہے تھے جس طرح ایک گہرا راز بتایا جاتا ہے۔ کہ اس کنوئیں میں ہاروت و ماروت دو فرشتے ایک فاحشہ سے عشق کرنے کے جرم میں قید کئے گئے تھے۔ کچھ جبہ پوش تو اصرار کر رہے تھے کہ وہ اب بھی اس جگہ قید ہیں۔ اور بعض تو یہاں تک کہتے تھے کہ ان کے کسی استاد نے ان کو الٹا لٹکے ہوئے دیکھا بھی ہے جسے سنکر کئی عقیدتمندوں کے جسم پر جھرجھری آجاتی تھی۔ تب مجھے معلوم ہوا۔ کہ انسانی گناہ نے فرشتوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ میں اسی حیرت میں تھا کہ میں نے پھر وہی آواز دلکش مؤثر شیریں آواز محبت اور جلال کی ایک عجیب آمیزش کے ساتھ بلند ہوتی ہوئی سنی۔ اسنے کہا فرشتے خدا کے بندے ہیں نہ کہ بیٹیاں۔ اور وہ پوری طرح اس کے فرمانبردار ہیں۔ کبھی بھی اسکے احکام کی نافرمانی نہیں کرتے۔ لوگوں میں پھر بیداری پیدا ہوئی۔ بہت سے لوگ خواب غفلت سے چونکے۔ اور اپنے عقائد پر شرمندہ اور نادم ہوتے کئی اونچی عمارتیں جو خدا کی بیٹیوں کے نام سے کھڑی کی گئی تھیں۔ گرا دی گئیں۔ اور ان کی جگہ خدائے واحد و قہار کی عبادت گاہیں کھڑی کی گئیں۔ وہ کنوئیں جو فرشتوں کے گناہوں کی یادگار تھے اجاڑ ہو گئے۔ زائرین نے ان کی زیارت ترک کر دی۔ میں نے دیکھا فرشتے خوش تھے۔ گویا ان کے لباسوں پہ گندے چھینٹے پڑ گئے تھے۔ جسے دھونے والے نے دھو دیا۔ میرے دل سے پھر ایک آہ نکلی۔ اور میں نے کہا یہ آواز ان فرشتوں کے لئے بھی ایک رحمت ثابت ہوئی۔

زمانہ کے لئے رحمت

میری نظر یہاں سے اٹھکر زمانہ کی طرف گئی۔ میں نے کہا۔ وقت کتنا لمبا ہے؟ کب سے یہ فرشتے کام کر رہے ہیں؟ کب سے سورج اور اسکے ساتھ کے سیارے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں؟ کون بتا سکتا ہے۔ کہ زمانہ جو کچھ بھی ہے اس نے کس قدر تغیرات دیکھے ہیں؟ کس طرح اور کب سے یہ خوشی اور غم کا پیمانہ بنا رہا ہے اگر وہ جاندار شے ہوتا۔ تو ایک بے اندازہ زمانہ تک اللہ کی مخلوق کی خدمت میں لگا رہنے پہ اسے کس قدر فخر ہوتا۔ میں اسی خیال میں تھا کہ مجھے زمانہ کے چہرہ پہ بھی دو داغ نظر آئے۔ مجھے کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے کہ زمانہ غیر فانی ہے۔ زمانہ خدا تعالیٰ کی طرح ازلی ابدی ہے۔ اور کچھ لوگ یہ کہتے سنائی دیئے کہ زمانہ ظالم ہے۔ اسنے میرا فلاں رشتہ دار مار دیا۔ زمانہ بُرا ہے۔ اس نے مجھ پہ فلاں تباہی وارد کر دی۔ میں نے کہا اگر زمانہ زندہ شے ہوتی تو وہ ان باتوں کو سنکر ضرور ملول ہوتا۔ مگر معًا وہی آواز پھر بلند ہوئی اسنے کہا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ زمانہ ہمارے آدمیوں کو مارتا اور تباہ کرتا ہے یا وہ خدا ہے۔ غلط کہتے ہیں۔ انہیں حقیقت کا کچھ علم نہیں۔ مارنا اور جلانا تو خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ وہ جب تک کسی چیز کو عمر دیتا ہے وہ قائم رہتی ہے۔ اور زمانہ اسکے ساتھ بمنزلہ ایک کیفیت کے رہتا ہے۔ اور پھر اس نے کہا زمانہ کیا ہے؟ خدا تعالیٰ کی صفات کا ایک ظہور ہے۔ پس تم جو اسے گالیاں دیتے ہو در حقیقت خدا تعالیٰ کو گالیاں دیتے ہو۔ میرا دل اس آواز والے کے اور بھی قریب ہو گیا۔ اور میں نے محبت بھرے دل سے کہا کہ یہ آواز تو زمانے کے لئے بھی رحمت ثابت ہوئی۔

زمین کے لئے رحمت

زمانہ سے ہٹ کر میری نگاہ کرۂ ارض پر پڑی۔ میں نے کہا ہماری دنیا دوسرے کُرّوں سے کچھ کم خوبصورت نہیں۔ بلکہ بظاہر زیادہ ہے۔ کیونکہ وہاں سے تو صرف روشنی آتی ہے اور یہاں روشنی کے علاوہ قسم قسم کے سبزے اور رنگ رنگ کے نظارے اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی بلند پہاڑیاں اور کلیلیں کرتی ہوئی ندیاں اور اچھلتے ہوئے چشمے اور سایہ دار وادیاں اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت اور پھولوں سے اَٹی ہوئی جھاڑیاں اور لہلہاتے ہوئے کھیت اور غلوں سے بھرے ہوئے کھلیان اور چہچہاتے ہوئے پرندے۔ اور ناز و رعنائی سے بھاگتے ہوئے چوپائے اور نہ معلوم کیا کیا کچھ بھرا پڑا ہے مجھے اس وقت زمین کچھ ایسی خوبصورت نظر آئی کہ درندوں اور وحوش اور سانپوں اور بچھوؤں اور دوسرے زہریلے کیڑوں اور مچھروں اور طاعون کے چوہوں تک میں مجھے خوبصورتی ہی خوبصورتی نظر آنے لگی۔ میں نے خیال کیا۔ کہ شیر بے شک وحشی جانور ہے اور کبھی کبھی انسانوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتا ہے۔ لیکن اگر شیر نہ ہوتا تو شیر افگن کہاں سے پیدا ہوتے۔ اگر بہادر شیر انسانوں کی بہادری کی آزمائش کے لئے نہ ہوتا۔ تو بہادری کی آزمائش کا یہی ذریعہ رہ جاتا کہ لوگ بنی نوع انسان پر حملہ کرکے اپنی شجاعت کی آزمائش کرتے۔ اور یہ جانور تو زندہ ہی نہیں مر کر بھی ہمارے کام آتا ہے۔ اس کی چربی اور اسکے ناخن اور اس کی کھال علاجوں اور زینت و زیبائش میں کیسی کار آمد ثابت ہوتی ہے۔

مجھے سانپ کے زہر سے زیادہ اسکے گوشت کے فوائد نظر آنے لگے اور میں نے کہا کہ اگر سانپ نہ ہوتا تو ہمارے اطباء قرص افعی کہاں سے ایجاد کرتے؟ اور اگر بچھو نہ ہوتا تو یہ گردوں کی پتھریوں کے مریض اپریشن کے بغیر کس طرح آرام پاتے؟ میں نے مچھر کو صرف کثرت رطوبت کا ایک الارم پایا۔ بیچارا چھوٹا سا جانور کس طرح رات دن ہمیں بیدار کرتا اور بتاتا ہے۔ کہ گھر میں نالیاں گندی رہتی ہیں۔ شہر کی بدرویں میلے سے بھری رہتی ہیں۔ لوگ پانی جیسی نعمت یونہی ضائع کر رہے ہیں۔ غرض رات دن ہمیں اپنے فرض سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ جب ہم ہوشیار ہی نہیں ہوتے اور سستی کا دامن نہیں چھوڑتے تو بیچارہ غصّہ میں آکر کاٹتا ہے۔ بیماری اتنی مچھر سے تو پیدا نہیں ہوتی جتنی کثرتِ رطوبت سے۔ جتنی گندی نالیوں کے تعفن سے۔ بدرووں کی غلاظت اور بے احتیاطی سے پھینکے ہوئے پانیوں سے۔ غرض مجھے ہر شے میں اسکے پیدا کرنیوالے کا حُسن نظر آنے لگا۔ ہر ذرہ میں ازلی ابدی محبوب کی شکل نظر آنے لگی۔ مگر ناگاہ میری نظر آبادیوں کی طرف اُٹھ گئی۔ اور میں نے دیکھا کہ لوگ پہاڑیوں۔ درختوں۔ پتھروں۔ دریاؤں۔ جانوروں کے آگے سجدے کر رہے ہیں۔ اور مغز کو بھول کر چھلکے پر فدا ہو رہے ہیں۔ میری طبیعت منغض ہو گئی اور میرا دل متنفر ہو گیا۔ اور مجھے شیر۔ سانپ بچھو تو الگ رہے مصفّٰے پانی میں بھی لاکھوں کیڑے نظر آنے لگے۔ اور سبزہ زار اور مرغزاروں سے بھی سڑے ہوئے سبزے کی دماغ سوز بُو آنے لگی۔ اور میں نے دیکھا کہ یہ زمین تو ایک دن رہنے کے قابل نہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوا گویا یہاں کی ہر شے مُردہ ہے اور اس کے نظارے ایک بدکار بڑھیا کی مانند ہیں۔ کہ باوجود ہزاروں بناوٹوں اور تزئینوں کے اس کی بدصورتی اور بدسیرتی چھپ نہیں سکتی۔ مگر میں اسی حالت میں تھا کہ پھر وہی آواز بلند ہوئی۔ پھر وہی شیریں۔ دل میں چبھ جانے والی آواز اُونچی ہوئی اور اس نے کہا کہ یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے۔ سب کچھ انسان کے نفع کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے پہاڑ اور اس کے دریا اور اس کے چرند اور اس کے پرند اور اس کے میوے اور اس کے غلے سب کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اعمال میں تنوع پیدا ہو۔ اور وہ ان امانتوں کے بہترین استعمال سے اپنے پیدا کرنے والے کا قرب حاصل کرے۔ اس زمین کی اچھی نظر آنے والی اور بظاہر بُری نظر آنے والی سب اشیاء انسان کے لئے آزمائش ہیں۔

پس مبارک ہے وہ جوان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے پیدا کرنیوالے کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ یوں معلوم ہوا گویا اس دنیا کے ذرّہ ذرّہ کے سر پر سے بوجھ اتر گیا۔ یہی جہاں ایک جنت نظر آنے لگا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اگلے جہان کی جنت اس جنت کا ایک تسلسل ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ بہت سے لوگ جنہوں نے اس آواز کو سنا۔ اپنی غلطیوں سے پشیمان ہو کر شرک و بدعت سے توبہ کر کے اپنے پیدا کرنے والے کی طرف دوڑ پڑے۔ پھر دنیا خدا کے جلال کا ظہور گاہ بن گئی پھر کسی کی تجلیاں اس میں نظر آنے لگ گئیں۔ اور میں نے ایک آہ بھر کر کہا۔ کہ یہ آواز ہماری زمین کے لئے بھی رحمت ثابت ہوتی ؛

انسانیت کے لئے رحمت

جب میں نے تمام مخلوقات میں سے انسان کی عبادتوں کو دیکھا۔ اور اس کی غلطیوں کے ساتھ اس کی توبہ پر نظر کی۔ اور اس کی ناکامیوں کے ساتھ اس کی متواتر جدّوجہد کا معائنہ کیا۔ تو میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اور میں نے کہا۔ اس خوبصورت دنیا میں ایسی اچھی مخلوق کیسی بھلی معلوم دیتی ہے۔ کس طرح دل کھینچتی ہے۔ مگر جب میں اس سرور سے متکیف ہو رہا تھا۔ یکدم میری نگاہ چند لوگوں پر پڑی۔ جنہوں نے سیاہ جبّے پہن رکھے تھے۔ جن کی بڑی بڑی داڑھیاں اور موٹی موٹی تسبیحیں اور سنجیدہ شکلیں انہیں مذہبی علماء ثابت کر رہی تھیں۔ ان کے گرد ایک جمگھٹا تھا۔ کثرت سے لوگ ان کی باتیں کو سنتے اور ان سے متاثر ہوتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کے اکثر لوگ انکی توجہ کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور ہو رہے ہیں۔ ان کے چہروں سے غم کے آثار ظاہر تھے اور ان کی باتوں سے درد اور محبت کی بُو آتی تھی انہوں نے لوگوں کو مخاطب کیا۔ اور کہا۔ کہ اے بدبخت انسانو! تم کیوں خوش ہو؟ آخر کس امید پر تم جی رہے ہو؟ کیا تم کو اس جہنم کے گڑھے کی خبر نہیں جو تمہارے آباء نے تمہارے لئے تیار کر رکھا ہے۔ وہ نہ بجھنے والی آگ جو گندھک سے بھڑک رہی ہے۔ وہ تاریکی جس کے سامنے اس دنیا کی تاریکیاں روشنی معلوم ہوتی ہیں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ پھر تم کیوں خوش ہو؟ تم کس منہ سے نجات کے طالب ہو اور تمہارا دل کس طرح اس کی تمنا کر سکتا ہے۔ تم نہیں سمجھتے کہ پاک اور ناپاک کا جوڑ نہیں؟ اور ماضی کا بدلنا کسی کے اختیار میں نہیں۔ تم میں سے کون ہے جو کہے کہ وہ پاک ہے؟ اور خدا تعالیٰ سے ملنے کا مستحق ہے؟ اور تم میں سے کون ہے جو کہے کہ وہ پاک ہو سکتا ہے؟ کیونکہ شریعت پاک نہیں ناپاک کرتی ہے۔ حکم فرمانبردار نہیں نافرمان بناتا ہے۔ کون ہے جو تمام حکموں پر عمل کر سکتا ہے؟ اور جس نے ایک ادنیٰ سے حکم کی بھی نافرمانی کی وہ باغی بن گیا۔ کیا عمدہ سے عمدہ شے کو ایک قطرہ ناپاکی کا ناپاک نہیں کر دیتا؟ پھر تم کس طرح خیال کر سکتے ہو کہ تم پاک ہو یا پاک ہو سکتے ہو۔ کیا تم کو یاد نہیں کہ تمہارے باپ آدمؑ نے گناہ کیا۔ اور خدا تعالیٰ کے فضلوں کو بھول گیا اور شیطان نے اس کو اور اس کی بیوی حوّا کو جو تمہاری ماں تھی ورغلایا اور گنہگار کر دیا؟ تم جو ان کی اولاد ہو کس طرح خیال کر سکتے ہو۔ کہ ان کے گناہ کے ورثہ سے حصّہ نہ لوگے؟ کیا تم امید کرتے ہو کہ ان کی دولت پر تو قابض ہو جاؤ اور ان کے قرضے ادا نہ کرو؟ ان کی نیکیاں تو تم کو مل جائیں۔ اور ان کے گناہ میں تم حصّہ دار نہ بنو؟ اور جب گناہ تم کو ورثہ میں ملا ہے تو تم اس ورثہ کی لعنت سے بچ کیونکر سکتے ہو؟ تم خیال کرتے ہو کہ خدا تعالیٰ تم کو معاف کر دیگا؟ نادانو! تم کو یاد نہیں کہ وہ رحم کرنے والا بھی ہے اور عدل کرنے والا بھی؟ اس کا رحم اس کے عدل کے مخالف نہیں چل سکتا۔ پس کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے خاطر اپنے عدل کو بھول جائے؟ میں نے دیکھا ان کی تقریروں میں مایوسی کی لہر بہت زبردست تھی۔ کہ امیدوں کے پہاڑ کو اڑا کر لے گئی۔ جو چہرے خوشیوں سے چمک رہے تھے حرمان و یاس سے پژمردہ ہو گئے۔ دنیا اور اس کے باشندے ایک کھلونا اور وہ بھی شکستہ کھلونا نظر آنے لگے۔ مگر ذرا سانس لے کر ان علماء نے پھر گرج کر لوگوں کو مخاطب کیا۔ اور کہا۔ مگر تم

مایوس نہ ہو۔ کہ جہاں تمہاری امیدوں کو توڑا گیا ہے۔ وہاں ان کے جوڑنے کا بھی انتظام موجود ہے۔ اور جہاں ڈرایا گیا ہے۔ وہاں بشارت بھی مہیا کی گئی ہے۔ خدا کے عدل نے تم کو سزا دینی چاہی تھی۔ مگر اس کے رحم نے تم کو بچا لیا۔ اور وہ اس طرح کہ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا کہ تا وہ بے گناہ ہو کر صلیب پر لٹکایا جائے۔ اور سچا ہو کر جھوٹا قرار پائے۔ چنانچہ وہ مسیح کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہوا۔ اور یہود نے اسے بلا کسی گناہ کے صلیب پہ لٹکا دیا۔ اور وہ تمام ایمان لانیوالوں کے گناہ اٹھا کر انکی نجات کا موجب ہوا۔ پس تم اس پر ایمان لاؤ وہ تمہارے گناہ اٹھا لے گا۔ اس طرح خدا کا عدل بھی پورا ہوگا اور رحم بھی۔ اور دنیا نجات پا جائے گی۔ میں نے دیکھا کہ مایوسی پھر دور ہو گئی۔ اور لوگ خوشیوں سے اچھلنے لگے اور ساری دنیا نے ایسی خوشی کی جس کی نظیر پہلے کبھی نہیں ملتی۔ اور لوگ آئے اور صلیب کو جو ان کی نجات کا موجب ہوئی روتے ہوئے چمٹ گئے۔ وہ بیتاب ہو کر کبھی اس کو بوسہ دیتے اور کبھی اس کو سینے سے لگاتے۔ اور ایک دیوانگی کے جوش سے انہوں نے اس چیز کا خیر مقدم کیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس جوش کے سرد ہونے پر بعض لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور آپس میں کہتے تھے کہ یہ تو بے شک معلوم ہوتا ہے کہ گناہ سے انسان بچ نہیں سکتا۔ لیکن امید کا پیغام کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر خدا کے لئے عادل ہونا ضروری ہے۔ تو اس کا بیٹا بھی ضرور عادل ہوگا اور اگر گنہگار کے گناہ کو معاف کرنا عدل کے خلاف ہے تو بے گناہ کو سزا دینا بھی تو عدل کے خلاف ہے۔ پھر کس طرح ہوا کہ خدا کے بیٹے نے دوسروں کے گناہ اپنے سر پہ لے لئے اور خدا نے اس بے گناہ کو پکڑ کر سزا دیدی؟ پھر انہوں نے کہا کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ موت کو تو گناہ کی سزا بتایا گیا تھا جب گناہ نہ رہا تو موت کیونکر رہ گئی؟ گناہ کے معاف ہونے پر موت بھی تو موقوف ہونی چاہیئے تھی۔ پھر بعض لوگوں نے کہا کہ ہم سے تو اب بھی گناہ سرزد ہو جاتے ہیں۔ اگر ورثہ کا گناہ دور ہو گیا تھا تو گناہ ہم سے باوجود بچنے کی کوشش کے کیوں ہو جاتا؟ جب بعض دوسروں نے ان کو دلیری سے یہ کہتے ہوئے سنا تو انہوں نے کہا کہ ہم سے بھی اور ہم سے بھی۔

پھر میں نے عالم خیال میں دیکھا کہ ان لوگوں نے کہا کہ خدا نے ہم کو کیوں پیدا کیا؟ انسانیت جو اس قدر اعلیٰ شے سمجھی جاتی تھی کیسی ناپاک ہے۔ کس طرح گناہ سے اس کا بیج پڑا اور گناہ میں اس نے پرورش پائی۔ اور گناہ ہی اس کی خوراک بنی اور گناہ ہی اس کا اوڑھنا اور بچھاؤنا ہوا۔ ایسی ناپاک شے کو وجود میں لانے کا مقصد کیا تھا؟ یہ لعنت کیا شے ہے؟ اور کس کے لئے ہے؟ کیونکہ ہم کو تو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور دوزخ کے سوا کسی شے کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی وہ انہی فکروں میں تھے کہ پھر وہی شیریں اور مست کر دینے والی آواز جو کئی بار پہلے دنیا کے عقدے حل کر چکی تھی۔ بلند ہوئی پھر اس آواز کی صداؤں سے پرکیف نغمے پیدا ہو کر دنیا پہ چھا گئے۔ پھر ہر شخص گوش بآواز ہو گیا۔ پھر ہر دل رجاء و امید کے جذبات سے دھڑکنے لگا۔ وہ آواز بلند ہوئی اور اس نے دنیا کو اس بارہ میں طویل پیغام دیا۔ جس کے مطلب اور مفہوم کو میں اپنے الفاظ میں اور اپنی تمثیلات سے ادا کرتا ہوں اس نے کہا جو کسی کے دل میں ناامیدی پیدا کرتا ہے وہ اس کے ہلاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ایمان کی کیفیت خوف و امید کی چار دیواری کے اندر ہی پیدا ہو سکتی ہے اور وہ بھی تب جب امید کا پہلو خوف پر غالب ہو۔ پس جو امید کو دور کرتا ہے وہ گناہ کو مٹاتا نہیں بڑھاتا ہے۔ اور خطرہ کو کم نہیں زیادہ کرتا ہے۔ آدم نے بیشک خطا کی لیکن وہ ایک بھولی دیدہ دانستہ گناہ نہ تھا۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ باپ جو کچھ کرے بیٹے کو اس کا ورثہ ملے۔ اگر یہ ہوتا تو جاہل ماں باپ کے بچے ہمیشہ جاہل رہتے۔ اور عالموں کے عالم۔ مسلول ماں باپ کے بچے ہمیشہ مسلول نہیں ہوتے۔ نہ کوڑھیوں کے بچے ہمیشہ کوڑھی ہوتے ہیں۔ بعض باتوں میں ورثہ ہے اور بعض میں ورثہ نہیں اور جہاں

ورثہ ہے۔ وہاں بھی خدا تعالیٰ نے ورثہ سے بچنے کے سامان پیدا کئے ہیں۔ اگر ورثہ سے بچنے کے سامان نہ ہوتے تو تبلیغ اور تعلیم کا مقصد کیا رہ جاتا؟ کافروں کے بچوں کا ایمان لے آنا بتاتا ہے کہ ایمان کے معاملہ میں خدا تعالیٰ نے ورثہ کا قانون جاری نہیں کیا۔ اگر اس میں بھی ورثہ کا قانون جاری ہوتا۔ تو مسیح کی آمد ہی بے کار رہ جاتی۔ اس نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو نیک طاقتیں دیکر پیدا کیا ہے پھر بعض انسان ان طاقتوں کو ترقی دیتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور بعض ان کو پاؤں میں روند دیتے ہیں اور نامراد ہو جاتے ہیں۔ قانون شریعت بیشک سب کا سب قابل عمل ہے۔ لیکن نجات کی بنیاد عمل پر نہیں ایمان پر ہے۔ جو فضل کو جذب کرتا ہے۔ عمل اس کی تکمیل کا ذریعہ ہے اور نہایت ضروری لیکن پھر بھی وہ تکمیل کا ذریعہ ہے اور ذریعہ کی کمی سے چیز کا فقدان نہیں ہوتا۔ بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے۔ لیکن پانی سے وہ بڑھتا ہے۔ ایمان بیج ہے اور عمل پانی جو اسے اوپر اٹھاتا ہے۔ خالی پانی سے درخت نہیں اُگ سکتا۔ لیکن بیج ناقص ہو اور پانی میں کسی قدر کمی ہو جائے۔ تب بھی درخت اُگ آتا ہے۔ کسان ہمیشہ پانی دینے میں غلطیاں کر دیتے ہیں۔ لیکن اس سے کھیت مارے نہیں جاتے۔ جب تک بہت زیادہ غلطی نہ ہو جائے۔ انسانی عمل ایمان کو تازہ کرتا ہے اور اس کی کمی اس میں نقص پیدا کرتی ہے لیکن اس کی ایسی کمی جو شرارت اور بغاوت کا رنگ نہ رکھتی ہو۔ اور حد سے بڑھنے والی نہ ہو ایمان کی کھیتی کو تباہ نہیں کر سکتی۔ اور شرارت و بغاوت بھی ہو۔ تو خدا کا عدل توبہ کے راستہ میں روک نہیں۔ عدل اس کو نہیں کہتے۔ کہ ضرور سزا دی جائے۔ بلکہ اس کو کہتے ہیں کہ بے گناہ کو سزا نہ دی جائے۔ پس گنہگار کو رحم کر کے بخشنا اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کے مخالف نہیں عین مطابق ہے۔ اگر عدل کے معنے یہ ہوں کہ ہر عمل کی عمل کے برابر جزا ملے۔ تو بخشش اور نجات کے معنے ہی کیا ہوئے؟ اس طرح تو نہ صرف گناہ کا بخشنا عدل کے خلاف ہوگا۔ بلکہ عمل سے زیادہ جزا دینا بھی عدل کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ عدل کے معنے برابر کے ہیں۔ اور اگر یہ صحیح ہو تو کسی شخص کو اس کی عمر کے برابر ایام کے لئے ہی نجات دی جا سکتی ہے۔ اور وہ بھی اس کے اعمال کے وزن کے برابر۔ مگر اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ پھر نہ معلوم خدا تعالیٰ کی رحمت کو اس مسئلہ سے کیوں محدود کیا جاتا ہے؟ اس نے کہا خدا مالک ہے اور مالک کے لئے انعام اور بخشش میں کوئی حد بندی نہیں وہ بیشک وزن کرتا ہے لیکن اس کا وزن اس لئے ہوتا ہے کہ کسی کو اس کے حق سے کم نہ ملے۔ نہ اس لئے کہ اس کے حق سے زیادہ نہ ملے مسیح بیشک بے گناہ انسان اور خدا کا رسول تھا۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ وہ دوسروں کا بوجھ اٹھا لے گا۔ قیامت کے دن ہر شخص کو اپنی صلیب خود ہی اٹھانی ہوگی۔ اور جو خود اپنی صلیب نہ اٹھا سکے گا وہ نجات بھی نہ پا سکے گا۔ سوائے اس کے کہ خدا کے فضل کے ماتحت اس کی بخشش ہو۔ اور خدا تعالیٰ خود کسی کا بوجھ اٹھا لے۔ پس یہ مت سمجھو کہ انسان فطرتاً ناپاک ہے۔ ہاں وہ جو خدا کی دی ہوئی خلعت کو خراب کر دے وہ ناپاک ہے۔ ورنہ خدا کے بندے اس کے قرب کے مستحق ہیں اور قرب پا کر رہیں گے۔

میں نے دیکھا اس آواز کو بلند ہوتا تھا۔ کہ دلوں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ خالق اور مخلوق کے تعلقات روشن ہو گئے اور مایوسیاں امید سے بدل گئیں۔ لیکن ساتھ ہی خشیت الٰہی امید کے ہم پہلو آ کر بیٹھ گئی اور ہر غلط اتکال اور نامناسب استغناء کا دروازہ بند ہو گیا۔ جو ہمت ہار بیٹھے تھے۔ وہ از سر نو شیطان سے آزادی کی جدوجہد میں لگ گئے۔ اور جو حد سے زیادہ امید لگائے بیٹھے تھے۔ اور دوسروں پر اپنا بوجھ لادنے کی فکر میں تھے۔ انہوں نے دوڑ کر اپنے بوجھ اپنے کاندھوں پر رکھ لئے۔ دنیا کی بے چینی دور ہو گئی۔ اور اطمینان دلوں میں خیمہ زن ہو گیا۔ اور اپنی روحانی آنکھوں سے دیکھا۔ کہ انسانیت خوشی سے اچھل رہی تھی۔ میرے دل سے پھر ایک آہ نکلی۔ ویسی ہی جیسے ایک معشوق سے دور پڑے ہوئے عاشق کے سینے سے نکلتی ہے۔ میں نے دور افق میں بُعد زمانی کی غیر متناہی روکوں کو دیکھا اور حسرت سے سر نیچے ڈال دیا۔ پھر جذبات سے بھرے ہوئے دل سے میری زبان سے نکلا۔ یہ آواز انسانیت کے لئے بھی رحمت ثابت ہوئی۔ (قسط اوّل تمام شد۔ باقی باقی)

ایڈریس بخدمت مکرم جناب شیخ محبوب عالم صاحب خالد

۱۷ر مئی کی شام کو جناب پروفیسر شیخ محبوب عالم صاحب خالد صدر شعبہ اردو تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر آپ کے اعزاز میں الوداعی تقریب منعقد کی گئی۔ اس تقریب میں ازراہ شفقت حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز بھی بنفس نفیس تشریف فرما تھے۔ کالج کے سٹاف ممبران کی طرف سے اپنے رفیق کار کے اعزاز میں مندرجہ ذیل ایڈریس پیش کیا گیا:۔

(ادارہ)

آج کی اس تقریب میں ہم اپنے ایک نہایت قابل قدر اور واجب الاحترام رفیق کار مکرم شیخ محبوب عالم صاحب خالد ایم۔اے صدر شعبہ اردو تعلیم الاسلام کالج ربوہ کو الوداع کہنے کی غرض سے جمع ہوئے ہیں۔ جو مسلسل ۲۲ برس تک بحیثیت استاد ہمارے کالج سے وابستہ رہنے کے بعد اب یہاں سے ریٹائر ہو کر ایک نہایت اہم جماعتی خدمت سے وابستہ ہو رہے ہیں۔

مکرم خالد صاحب کی یہ نہایت درجہ خوش بختی ہے کہ آپ کو عمر بھر مختلف رنگوں میں سلسلہ عالیہ احمدیہ کی خدمت کا بھرپور موقع ملا ہے۔ آپ اس منفرد اعزاز کے بھی حامل ہیں کہ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے تحت آپ ہی احمدی نوجوانوں کے اس تاریخی اجلاس کے داعی تھے۔ جس میں مجلس خدام الاحمدیہ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ پھر سیدنا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے ساتھ اوائل عمر سے آپ کا محبانہ تعلق رہا ہے۔ اور حضور بھی جس رنگ میں آپ پر شفقت اور اعتماد فرماتے رہے ہیں وہ ہم سب کے لئے باعث رشک ہے۔

محترم خالد صاحب کالج میں تدریسی فرائض کی ادائیگی کے علاوہ برسر (BURSAR) کی حیثیت میں لمبے عرصہ تک یہاں کے دفتری امور کی نگرانی کا فریضہ نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے ہیں۔

قواعد وضوابط کے بارہ میں آپ کی مسلمہ مہارت ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس سے آپ کے قریباً سبھی رفقاء مستفید ہوتے رہے ہیں۔ آپ کی ہمت واستقلال، علمی ذوق، انتظامی قابلیت کام کی لگن اور پابندی وقت۔ یہ سب خوبیاں قابل ذکر ہیں۔ اور آپ کے جانے کے بعد بھی ہمیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کا ہر آن حافظ و ناصر رہے۔ صحت و سلامتی سے خوش و خرم رکھے۔ اور خدمت دین کے بیش از بیش مواقع عطا فرماتا رہے۔ آمین

ہم ہیں

ممبران سٹاف تعلیم الاسلام کالج

ربوہ

مسعود مفتی
لاڑکانہ

افسانہ

گورکن

مکرمی عاصم صاحب

السلام علیکم "گورکن" کے متعلق آپ کا دوسرا خط ملا - پہلے جواب دے چکا ہوں کہ "افسانوی مجموعے محدب شیشہ میں سے انتخاب" کا حوالہ دیکر آپ یہ یا کوئی اور افسانہ اپنے میگزین میں شائع کر سکتے ہیں - غالباً ڈاک میں ادھر ادھر ہو گیا ہو گا - والسلام

خاکسار - مسعود مفتی
۲۷ مئی ۶۹ء

"یا مولا! کسی کو بے موت ہی مار ڈال"

اللہ بخش نے منہ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا - اور لمبی سیدھی سڑک کو مایوسی سے دیکھنے لگا - جس پر کوئی آدمی نظر نہ آتا - دور بس سٹاپ پر دو چار آدمی کھڑے تھے - کھمبے کے نیچے پان سیگریٹ والا اکڑوں بیٹھا تھا - لیکن اس سے پچھلے موڑ سے کوئی سائیکل سوار نہ آتا تھا - جو اس کے دل میں امید بندھاتا - عام طور پر جب بھی کوئی سائیکل سوار تیزی سے موڑ کاٹتا - اللہ بخش کی آنکھیں اسی پر جم جاتیں - ٹاہلی کے پچھلے چار درختوں تک اس کے پیڈل زور سے چلتے - اور اگر پانچویں کیکر پر آکر قدم رک جاتے اور سائیکل شہد کی دھار کی طرح نرمی سے پھسلنے لگتی تو اللہ بخش کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتیں - اور حقے کی نے پر اس کے ہونٹ کھلے - وہ جماتے - پھر دو سو گز آگے آکر جب سائیکل سڑک سے پھسل کر پگڈنڈی پر اترتا تو اللہ بخش بے اختیار پکار اٹھتا -

"مولا تیرا شکر ہے"

اور چند لمحوں میں آنے والا سائیکل کو قبرستان کی کچی دیوار سے ٹکا کر اسے کسی کی موت کی خبر سناتا - وہ مسکراہٹ دباتا ہوا قبر کا سائز پوچھتا - تو آنے والا یا تو اسے فٹ کا حساب بتاتا - یا جیب سے مروڑے ہوئے کاغذ پر لپٹا ہوا دھاگہ نکال کر اللہ بخش کے حوالے کرتا - اس کا دل دھاگا کھولتے اچھلتا رہتا - کہ نامعلوم کس سائز کی قبر تیار کرنا پڑے - اور اس کے کتنے پیسے ملیں - دھاگے کا ایک سرا ہاتھ میں پکڑ کر وہ بازو سیدھا کھڑا کرتا - اور لٹکے ہوئے دھاگے کے نچلے سرے کو دیکھتا ہوا بڑے کاروباری انداز میں پوچھتا:-

"اور کب لاؤ گے جی میت"

آنے والا میت کا لفظ سنکر کانپ سا جاتا - لیکن اللہ بخش خیال کئے بغیر جواب لے کر کدال سنبھالنے لگتا -

یہ عجیب اتفاق تھا کہ پچھلے ایک ہفتہ سے کوئی مردہ نہیں آیا تھا - اور اللہ بخش کی آمدنی کا بھرپور وسیلہ بند تھا -

پھر بارش بھی ہوتی رہی تھی - کوئی اللہ والا فاتحہ کو بھی نہیں آتا تھا - دو ایک آئے بھی لیکن اسے کچھ دیئے بغیر چلے گئے - وہ سوچتا تھا پچیس ہزار کی آبادی اور ایک بھی موت نہیں ہوئی - کہیں ایسا تو نہیں کہ کمیٹی نے کوئی اور قبرستان بنا دیا ہو - اس نے سیکرٹری کو خوش تو بڑا رکھا ہوا تھا - اسی وجہ سے دوسرے قبرستان کی سکیم ہر دفعہ کمیٹی سے نامنظور ہو جاتی تھی -

لیکن جہنم میں جائیں سب ڈاکٹر جو ستّر اسّی سال کے کھوسٹ لوگوں کو بھی بار بار موت سے بچا لیتے ہیں۔ اور اپنی آمدنی کے لاچ میں دوسروں کی روزی مارتے ہیں۔ اُس نے گردن ہلا کر نفرت سے زمین پہ تھوکا۔ پوٹلی اٹھائی۔ اُس میں سے تمباکو کی پتی نکال کر ہاتھوں میں مسلی۔ چھوٹی سی چلم زمین پہ مار کر راکھ جھاڑی۔ اُس میں پتی جمائی۔ اُوپر حقہ کی نَے سے پانی کے دو قطرے ٹپکائے۔ اور منہ نلکی سے لگا کر ماچس چلم پہ لگائی۔ تیلی کا شعلہ ایسے چلم پہ چپکا۔ جیسے بچہ کتے سے ڈر کر ماں کی چھاتی میں چھپتا ہے۔ اللہ بخش نے "کھوں" کر کے بہت سا دھواں مُنہ سے اگل دیا اور پکار اُٹھا۔

"توبہ میری۔ اتنا مندا کبھی نہ دیکھا تھا۔ پتہ نہیں ملک الموت بھی کہیں مر گیا ہے"۔

اللہ بخش بیزار تھا۔ کیونکہ پچھلے دس دن سے اُس نے گھر میں کوئی پیسے نہ دیئے تھے۔ ایک دفعہ وہ گھر گیا تھا۔ لیکن خالی ہاتھ۔ اُس کے دس سالہ بچے شرفو نے پتنگ کے لئے پیسے مانگے تو وہ نہ دے سکا۔ حالانکہ پتنگ کے لئے اُس نے کبھی انکار نہ کیا تھا۔ ساری عمر اُس نے خود خوب پتنگ بازی کی تھی۔ ہر وقت قبرستان میں رہنے والا قبروں سے تو بات نہ کر سکتا تھا۔ اُس کا باپ اُسے وہیں چھوڑ کر خود اِدھر اُدھر چلا جاتا۔ اور اگر اُسے پتہ چلتا کہ بعد میں اللہ بخش غیر حاضر رہا ہے تو وہ اُسے شہتوت کی سیونٹی سے مارتا۔

"اے ماں کے خصم! جنازے کا بھی کوئی اعتبار ہے تو کیا سمجھا ہے۔ کہ موت کے بھی دفتری ٹیم (TIME) ہیں"

اسی لئے اللہ بخش قبرستان میں ہی اچک اچک کر پتنگ اڑاتا رہتا۔ اب تو پچاس برس کی عمر میں وہ یہ شغل چھوڑ چکا تھا۔ لیکن اپنے لڑکے شرفو کو پتنگ اڑاتے دیکھ کر اس کا دل بھی اُچھلنے لگتا۔ اس لئے وہ اُسے کبھی نہ روکتا۔ بلکہ پیچ لڑانے کے ڈھنگ بتایا کرتا۔

لیکن اللہ بخش کو سب سے زیادہ دکھ یہی تھا کہ اسے تنگدستی کی وجہ سے بچے کو پیسوں سے انکار کرنا پڑا۔ اس لئے وہ دو تین روز گھر بھی نہ گیا تھا۔ اور قبرستان کی کوٹھڑی میں پڑا رہا یا باہر نکل کر مایوس نظروں سے سڑک دیکھتا رہا۔ وہ خود تو قبرستان میں ہی رہتا تھا۔ البتہ بیوی اور دس سالہ لڑکے شرفو کو شہر میں رکھا تھا۔ جہاں بندو چاچا ان کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ دوسرے چوتھے روز اللہ بخش گھڑی بھر کو چلا جاتا۔ بیوی کو دھوتی کی ڈھب سے روپے کھول کر دیتا۔ شرفو کے پتنگ کو دو چار تنکے مارتا۔ چاچے بندو کی دوکان پر چلم کے چار کش لیتا۔ بازار میں اڑوس پڑوس کی بات کرتا۔ اور پھر واپس قبرستان آجاتا۔ جہاں کیکر اور دھریک کے درختوں کے جھنڈ میں اس کی کوٹھڑی تھی۔ اور حقہ تھا۔ کسی کے مرنے کی خبر آتی۔ تو وہ قبر کھودنے، جنازے کا انتظار کرنے، وضو کیلئے کوزے اکٹھے کرنے اور قبر پہ انڈیلنے کے لئے پانی کے گھڑے بھرنے میں مصروف رہتا۔ کوئی لوگ عزیزوں کی قبر پہ فاتحہ خوانی کے لئے آتے تو وہ بھی وہاں پہنچ جاتا۔ اور اس پریت سے قبر پہ سے خشک پتے ہٹاتا۔ اور مٹی کے ڈھیلے اردگرد جماتا۔ جیسے قبرستان میں وہ سب سے زیادہ اسی قبر کا خیال رکھتا ہے۔ فاتحہ والے اُسے کچھ دے دیتے۔ تو وہ قبر کی سب دلچسپی بھول کر انہیں وہیں چھوڑتے ہوئے کوٹھڑی میں آکر حقہ پینے لگتا۔

اللہ بخش نے اسی کوٹھڑی میں پچاس برس پہلے جنم لیا تھا جب یہاں تھوڑی سی قبریں تھیں۔ انہی قبروں کی ڈھیریوں کے سہارے اُس نے چلنا سیکھا تھا۔ ماں سے روٹھ کر یا باپ سے ڈر کر وہ پکی قبروں کے بڑے کتبوں کے پیچھے چھپ جایا کرتا تھا۔ قبرستان کے روایتی ڈر کا اُسے کبھی احساس بھی نہ ہوا۔ خواہ تاروں بھری ٹھنڈی رات ہو۔ یا بجلیاں برساتے طوفانی اندھیرے۔ جب اس نے شعور سنبھالا تو ہر طرف قبریں دیکھیں۔ جن میں کبھی کبھار جنازے آیا کرتے تھے دس پندرہ خاموش سے آدمی اور چار پانچ شور کرتی عورتیں۔ بڑ کے پیڑ کے نیچے جنازہ رکھا جاتا۔ لائن بنائی جاتی۔ جس میں سے مولوی صاحب ضرور ایک کو آگے پیچھے کرتے۔ پھر مولوی صاحب تھوڑی دیر بعد لمبی آواز میں چلاتے۔ تو پیچھے کھڑے لوگ اپنی آوارہ نظریں سمیٹ

کر سامنے والوں کی ایڑیاں دیکھنے لگتے۔ اس کا باپ اچھی بھلی تیار شدہ قبروں سے خواہ مخواہ مٹی ادھر ادھر کرتا رہتا۔ اور وہ باپ کے اشارے کا منتظر درخت کی اوٹ میں چھپا رہتا۔ جیسے ہی مردہ لحد میں اتارا جاتا اللہ بخش لپک کر چارپائی سے نئے لٹھے کی سفید چادر اٹھا کر سیدھا ماں کو دے آتا۔ جو پہلے ہی انتظار میں ہوتی۔ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد اس کا باپ ساری چادریں لے کر حاجی کریم اللہ کپڑے والے کی دوکان پر جاتا۔ اور روپے ڈھب میں ڈال کر دھکتے ہوئے چہرے سے واپس آتا۔

اللہ بخش کو احساس ہی نہ تھا۔ کہ موت کیا ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے کاروبار تھا۔ دوسروں کی موت میں اس کی زندگی تھی۔ اور ان کی زندگی سے اس کے اپنے مرنے کا ڈر تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ چاہتا تھا۔ کہ دوسرے ایسے ہی مرتے رہیں۔ جیسے کہ تیس سال پہلے ہفتے میں مرتے تھے۔ کیا دن تھے وہ بھی!!! ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ سات سات مردوں کی نماز جنازہ اکٹھی پڑھنا پڑی۔ اور کام سے نپٹنے کے لئے اسے علیحدہ مزدور لگانے پڑے۔ ان دنوں تو وہ خاصا افسر بن گیا تھا۔ دس مزدور اس نے رکھ لئے تھے اور خود ہاتھ میں ڈانڈا لئے ان کی نگرانی کرتا رہتا۔ انہیں کدالیں بھی اپنے پاس سے خرید کر دیں۔ اب تک وہی اس کے کام آ رہی تھیں۔ اتنی آمدنی ہوئی تھی ان دنوں۔ کہ اس نے ٹھاٹھ سے اپنی شادی رچائی۔ ورنہ تو اتنے نک چڑھے گورکن کی بیٹی کا رشتہ اسے کون دیتا تھا۔ اور جب بیوی پہلی مرتبہ آئی تو سب قبروں پہ دیئے روشن کئے تھے۔ کیا بہار تھی وہ بھی۔ اور اب تو نئی نئی دواؤں کی وجہ سے وبا آتی ہی نہ تھی۔ اسی لئے وہ گذشتہ برس سے بائیں آنکھ کے موتیے کا اپریشن بھی نہ کرا سکا تھا۔

ویسے اپنے کاروبار میں اللہ بخش کافی ہوشیار تھا۔ قبرستان کے باہر بورڈ لگا تھا۔ کہ چھوٹی میت کی قبر کی کھدائی پانچ روپے اور بڑی قبر کی کھدائی دس روپے ہے۔ لیکن بورڈ کے حروف اس نے بڑی چابکدستی سے بیچ بیچ میں سے مٹا دیئے تھے۔ اور عام طور پہ پندرہ روپے فیس لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو کہتا:۔

"بادشاہو! ادھر بورڈ لگا ہے۔ خود دیکھ لو"۔

دیکھنے والا اگر چلا بھی جاتا تو کچھ نظر نہ آتا۔ زنگ آلودہ سلیٹ کو انگلیوں سے صاف کرنے پر اگر کسی حرف کا بچا کھچا کونا نظر آ جاتا۔ اور وہ کوشش سے پڑھ بھی لیتا تو اللہ بخش کہتا۔

"جو ناب! دیکھتے ہیں عرصہ سے بارش نہیں ہوئی۔ پتھر کی طرح زمین سخت ہے۔ دو آدمی ساتھ لگائیں گے۔ تب ہی قبر تیار ہو گی۔ ان کو بھی تو مزدوری دینا ہے"۔

اور کبھی بارش ہوئی ہوتی تو کہتا:۔

"جو ناب! آپ کو کیا پتہ کتنا مشکل کام ہے۔ مٹی اتنی نرم ہے۔ کہ بار بار کنارے اندر گر جاتے ہیں دو آدمی ساتھ لگانا پڑیں گے"۔

لاش قبر میں اتارنے کے بعد جب سب لوگ ایک ایک مٹھی مٹی کی پھینک دیتے۔ تو وہ بڑی تندہی سے کدال چلا کر ڈھیری بناتا۔ دونوں ہاتھوں سے سطح ہموار کرتا۔ دو تین پانی کے چھڑکتا اور مُردے کے وارث سے دس پندرہ قدم دُور چلا جاتا۔

"جو ناب! اگر حکم ہو تو ڈھیری جمانے کیلئے دو چار دن مشکی سے پانی ڈلوا لوں"۔

وہ فاصلہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پکار کر کہتا۔ دو ایک بزرگ فوراً ہاں! پکار اُٹھتے۔ اور وارث کی جیب کا بوجھ اور ہلکا ہو جاتا۔

"اور جو ناب اگر حکم ہو تو پہلی تین جمعراتوں کو پنج تن پاک کا دیا بھی جلا دوں"۔

متوفی کے خاندان سے تعلقات کا دعویٰ کرنے والے چند لوگ فوراً ہاں ہاں پکار اُٹھتے اور وارث کی پیشانی سکڑ جاتی۔

اللہ بخش پہلے دس پندرہ دن ہر نئی قبر کا خاص خیال رکھتا۔ کیونکہ رشتہ دار آتے رہتے تھے۔ بعد ازاں ہر جمعرات کو اور پھر تہواروں پہ قبر درست کیا کرتا۔ زندوں کا مردوں سے واسطہ ہی اتنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اللہ بخش بیل یا گدھے کو قبر کے اُوپر سے گزار دیتا۔ جس سے کنارے ٹوٹ جاتے۔ پوٹی دب جاتی۔ اور

کر سامنے والوں کی ایڑیاں دیکھنے لگتے۔ اس کا باپ اچھی بھلی تیار شدہ قبروں سے خواہ مخواہ مٹی ادھر ادھر کرتا رہتا۔ اور وہ باپ کے اشارے کا منتظر درخت کی اوٹ میں چھپا رہتا۔ جیسے ہی مردہ لحد میں اتارا جاتا اللہ بخش لپک کر چارپائی سے نئے لٹھے کی سفید چادر اٹھا کر سیدھا ماں کو دے آتا۔ جو پہلے ہی انتظار میں ہوتی۔ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد اس کا باپ ساری چادریں لے کر حاجی کریم اللہ کپڑے والے کی دوکان پر جاتا۔ اور روپے ڈھب میں ڈال کر دھکتے ہوئے چہرے سے واپس آتا۔

اللہ بخش کو احساس ہی نہ تھا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے کاروبار تھا۔ دوسروں کی موت میں اس کی زندگی تھی۔ اور ان کی زندگی سے اس کے اپنے مرنے کا ڈر تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ چاہتا تھا۔ کہ دوسرے ایسے ہی مرتے رہیں۔ جیسے کہ تیس سال پہلے ہفتے میں مرتے تھے۔ کیا دن تھے وہ بھی!!! ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ سات سات مردوں کی نماز جنازہ اکٹھی پڑھنا پڑی۔ اور کام سے نپٹنے کے لئے اسے علیحدہ مزدور لگانے پڑے۔ ان دنوں تو وہ خاصا افسر بن گیا تھا۔ دس مزدور اس نے رکھ لئے تھے اور خود ہاتھ میں ڈانڈا لئے ان کی نگرانی کرتا رہتا۔ انہیں کدالیں بھی اپنے پاس سے خرید کر دیں۔ اب تک وہی اس کے کام آ رہی تھیں۔ اتنی آمدنی ہوئی تھی ان دنوں۔ کہ اس نے ٹھاٹھ سے اپنی شادی رچائی۔ ورنہ تو اتنے نک چڑھے گورکن کی بیٹی کا رشتہ اسے کون دیتا تھا۔ اور جب بیوی پہلی مرتبہ آئی تو سب قبروں پہ دیئے روشن کئے تھے۔ کیا بہار تھی وہ بھی۔ اور اب تو نئی نئی دواؤں کی وجہ سے وبا آتی ہی نہ تھی۔ اسی لئے وہ گذشتہ برس سے بائیں آنکھ کے موتیے کا اپریشن بھی نہ کرا سکا تھا۔

ویسے اپنے کاروبار میں اللہ بخش کافی ہوشیار تھا۔ قبرستان کے باہر بورڈ لگا تھا۔ کہ چھوٹی میت کی قبر کی کھدائی پانچ روپے اور بڑی قبر کی کھدائی دس روپے ہے۔ لیکن بورڈ کے حروف اس نے بڑی چابکدستی سے بیچ بیچ میں سے مٹا دیئے تھے۔ اور عام طور پہ پندرہ روپے فیس لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو کہتا:۔

"بادشاہو! ادھر بورڈ لگا ہے۔ خود دیکھ لو"۔

دیکھنے والا اگر چلا بھی جاتا تو کچھ نظر نہ آتا۔ زنگ آلودہ سطح کو انگلیوں سے صاف کرنے پہ اگر کسی حرف کا بچا کھچا کونا نظر آ جاتا۔ اور وہ کوشش سے پڑھ بھی لیتا تو اللہ بخش کہتا۔

"جو ناب! ادھر بارش نہیں ہوئی۔ پتھر کی طرح زمین سخت ہے۔ دو آدمی ساتھ لگائیں گے۔ تب ہی قبر تیار ہو گی۔ ان کو بھی تو مزدوری دینا ہے"۔

اور کبھی بارش ہوئی ہوتی تو کہتا:۔

"جو ناب! آپ کو کیا پتہ کتنا مشکل کام ہے۔ مٹی اتنی نرم ہے۔ کہ بار بار کنارے اندر گر جاتے ہیں دو آدمی ساتھ لگانا پڑیں گے"۔

لاش قبر میں اتارنے کے بعد جب سب لوگ ایک ایک مٹھی مٹی کی پھینک دیتے۔ تو وہ بڑی تندہی سے کدال چلا کر ڈھیری بناتا۔ دونوں ہاتھوں سے سطح ہموار کرتا۔ دو تین پانی کے چھڑکتا اور مُردے کے وارث سے دس پندرہ قدم دُور چلا جاتا۔

"جو ناب! اگر حکم ہو تو ڈھیری جمانے کیلئے دو چار دن مشکی سے پانی ڈلوا لوں"۔

وہ فاصلہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پکار کر کہتا۔ دو ایک بزرگ فوراً ہاں! پکار اُٹھتے۔ اور وارث کی جیب کا بوجھ اور ہلکا ہو جاتا۔

"اور جو ناب اگر حکم ہو تو پہلی تین جمعراتوں کو پنج تن پاک کا دیا بھی جلا دوں"۔

متوفی کے خاندان سے تعلقات کا دعویٰ کرنے والے چند لوگ فوراً ہاں ہاں پکار اُٹھتے اور وارث کی پیشانی سکڑ جاتی۔

اللہ بخش پہلے دس پندرہ دن ہر نئی قبر کا خاص خیال رکھتا۔ کیونکہ رشتہ دار آتے رہتے تھے۔ بعد ازاں ہر جمعرات کو اور پھر تہواروں پہ قبر درست کیا کرتا۔ زندوں کا مردوں سے واسطہ ہی اتنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اللہ بخش بیل یا گدھے کو قبر کے اُوپر سے گزار دیتا۔ جس سے کنارے ٹوٹ جاتے۔ پوٹی دب جاتی۔ اور

ایک آدھ گڑھا پڑھ جاتا۔ اگلی دفعہ آنے والا رشتہ دار خفا ہوتا اور خفگی کے بعد آئندہ احتیاط کے آرڈر کی قیمت بھی ادا کر جاتا۔ نئے مرنے والوں کے گھروں سے جمعرات اور تہواروں کا کھانا علیحدہ تھا۔ اس کی مانگنے کے بھی قواعد تھے۔ مرنیوالے بچوں کی ماں سے مانگو۔ جوانوں کے باپ سے مانگو۔ ساس سے کبھی نہ مانگو۔ بوڑھوں کے سب سے بڑے بیٹے سے مانگو۔ رونے والوں کی باری ہوتی ہے۔ ایک شخص شدت سے روتا ہے۔ اور باقی اُسے چپ کراتے ہیں۔ اس کے چپ ہونے پر دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ جو شخص بار بار روئے اس سے کچھ نہ مانگو کیونکہ وہ سب سے زیادہ ہوشیار رہے۔ اور کچھ نہ دیگا۔ ایسے وقت میں مانگو۔ جب دینے والا دو چار آدمیوں میں کھڑا ہو۔ چالیسویں پہ جتنا لے سکتے ہو لو۔ کیونکہ بعد ازاں بہت کم لوگ قبر کی خبر لیتے ہیں۔

وہ اپنی تفریح کا سامان بھی موت سے کیا کرتا تھا۔ فلاں آدمی روتا کیسے ہے جیسے آٹے کی چکی مٹھو کٹھو کر رہی ہو۔ آج پھر مولوی شیر علی جنازے کے ساتھ آیا تھا۔ عجیب طریقے سے دعا پڑھتا ہے یہ بھی۔ جیسے رٹے طوطا بول رہا ہو۔ یہ بوڑھا بھی خوب آدمی تھا۔ رونا تو آتا نہ تھا۔ خواہ مخواہ دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے مُنہ لبسور رہا تھا۔ جیسے پیٹ میں درد ہو۔ کتنی مضحکہ خیز شکل بن جاتی تھی اُس کی۔ اور وہ کوٹھڑی میں پڑا حقّہ پہ مُنہ جمائے پہروں ہنسا کرتا۔ اگر کسی ساس یا سسر کی قبر پہ دو بہوئیں اپنے خاوندوں سمیت آجاتیں تو اُسے بڑا لطف آتا۔ دونوں بہوئیں ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر رونے کی کوشش کرتیں۔ اور اتنا شور کرتیں۔ کہ وہ حقّہ پہ ہونٹ جما کر مسکراہٹ چھپانے لگتا۔ اُس دن اُسے آمدنی بھی ہو جاتی۔ جب موٹی عورتیں قبروں سے لپٹ کر روتیں۔ تو وہ پیچھے کھڑا اُن کی ہلتی ہوئی پشت کی تھر تھراہٹ پہ دل ہی دل میں ہنستا جاتا۔ جیسے آگ پہ پڑی ہوئی کیتلی کا ڈھکن اُچھلتا رہتا ہے۔ جوانی کے دنوں میں اللہ بخش ہمیشہ اس موقعہ کی تاڑ میں رہتا۔ جب برادری کی

بہت سی عورتیں اکٹھی فاتحہ خوانی کے لئے آتیں۔ اُن کے سوگ کا انداز خاندانی سیاست کے تناسب سے متعین ہوتا تھا۔ بعض تو ایسی اداکاری کرتی کہ پیٹتے پیٹتے بے حال ہو جاتیں۔ برقعہ غائب۔ دوپٹہ پہلے بازوؤں میں اُلجھتا۔ اور پھر اُڑ کر ساتھ والے کیکر پہ جا گرتا۔ گریبان کھل جاتے۔ اور اللہ بخش ...... دیکھتا ہی جاتا۔ بعض اوقات ان میں سے ایک آدھ غش کھا کر گر پڑتی اور باقیوں کی چیخیں اُسے مدد کو بلاتیں۔ وہ دوڑ کر چارپائی اُٹھا لاتا۔ اور بعض دفعہ اُسے خود ہی اُٹھا کر اُسے چارپائی پر ڈالنا پڑتا۔ تب وہ کوٹھڑی میں حقہ پیتے ہوئے گھنٹوں اس موقعہ کا ذہنی طور پہ مزا لیتا رہتا۔ ایک عورت سے تو اُس کا معاشقہ بھی چل نکلا تھا وہ دو ایک دفعہ قبر پہ آکر بے ہوش ہوئی۔ اور اللہ بخش نے اُسے سنبھالا۔ اور بعد ازاں اُسے کافی عرصہ تک بغیر بے ہوش ہوئے سنبھالتا رہا۔ اللہ بخش کے لئے موت نہ تو حادثہ تھی۔ نہ المیہ۔ غمزدہ چہرے، اُبلتے ہوئے آنسو، دبی ہوئی سسکیاں۔ فاتحہ کے لئے اُٹھے ہوئے پُر خلوص ہاتھ اور بھیگی بھیگی آنکھیں اُس کے دل میں کوئی تاثر پیدا نہ کرتی تھیں۔ جب مردے کو لحد میں اتارنے سے پہلے کفن کھول کر چہرہ دکھایا جاتا تو ایک کہرام مچ جاتا۔ لیکن اللہ بخش اس وقت بھی قبر میں سے پاؤ پاؤ مٹی نکالتا رہتا۔ اور لوگوں کو کنارے سے پرے ہٹاتا رہتا۔ بوڑھے والدین اپنی جوانا مرگ اولادوں کی قبروں پہ آتیں۔ یا معصوم بچے اپنی ماں کی تربت سے لپٹ کر "امی امی" پکاریں، یا کسی لطیف رشتے والی ہستی دنیا کی نظروں سے چھپ چھپ کر کسی ڈھیری پہ چپ چاپ آنسو بہاتی رہے وہ ان سب کی دلی حالت سے بے پرواہ پیسے بٹورنے کی فکر میں رہتا۔ قبر کھودنے میں بھی وہ کبھی ملول نہ ہوا تھا۔ بلکہ کدال چلاتے ہوئے ماہیا کے بول الاپتا رہتا۔ اور اگر کبھی زیادہ پیسوں کے ملنے کا یقین ہوتا۔ تو ہر دو چار ہاتھ چلانے کے بعد کدال سر پہ اُٹھا کر قبر میں ہی ناچنے لگتا۔ اور جب لحد تیار ہو جاتی۔ تو اندر نرم نرم مٹی پہ بیٹھ کر حقہ پیتا رہتا۔ ایک دن بندو چچا اُسے پوچھتے پوچھتے قبر کے کنارے تک

آگیا۔ "او بخشا۔ تو جندگی میں ہی قبر میں گھس پڑا۔ باہر بیٹھ کر حقہ نہیں پی سکتا کیا؟" اللہ بخش نے نتھنے پھُلا کر دھواں باہر پھینکا اور کھانس کر بولا۔

"ہماری تو جندگی ہی قبروں میں ہے چاچا۔ گڑھا
کھودتے رہیں تو اپنے پیٹ کا گڑھا بھرتا ہے۔
مجھے ڈر بھی نہیں آتا اس میں بیٹھے بیٹھے۔"

"ڈر کاہے کا پگلے۔ تانگے کا کوچبان بھی تو رات
گھر آ کر گھوڑوں سے ہی لاڈ کر لیتا ہے۔ ہم کیوں
نہ دم بھر کو لاڈ کریں اس سے۔"

اسی طرح اللہ بخش کی ساری عمر قبروں سے لاڈ کرتے گزری لیکن پچھلے ہفتہ بھر سے قبر کھودنا ملی ہی نہ تھی۔ وہ پیار کس سے کرتا۔ سارا سارا دن اونگھتے گزر جاتا۔ چلم پی پی کر اُس کی چھاتی پکنے لگی تھی۔ سڑک کی طرف دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

"یا مولا! کسی کو بے موت ہی مار ڈال۔" قبل دوپہر کا تیز سورج اس کی پیشانی پہ چمک رہا تھا۔ پیڑ کے قریب اللہ بخش حقہ سینے سے چھوڑے دھیرے دھیرے کش لے رہا تھا۔ اسکی نظریں سڑک کی طرف لگی تھیں اور انگلیوں میں گھاس کے تنکے مروڑ رہا تھا۔ ایک سائیکل سوار تیزی سے موڑ مڑا۔ اللہ بخش کے ہونٹ کش لگانے سے پہلے کھلے رہ گئے۔ سائیکل آ رہی تھی۔ اور وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ پانچویں کھمبے کے پاس آ کر سوار نے پیڈل روک لئے۔ اللہ بخش کا سانس رک گیا ...... سائیکل پھسلتی آئی اور .... اور ...... سڑک سے ہٹ کر پگڈنڈی پہ مڑ آئی۔ "شکر ہے مولا تیرا"۔ اللہ بخش اچھل پڑا۔ "سن لی تو نے مجھ غریب کی"۔ سائیکل سوار قریب آیا۔ لیکن اترا نہیں۔ وہ پندرہ سولہ برس کا لڑکا تھا۔ دروازے کے پاس آ کر اس نے تیزی سے پیڈل الٹے گھماتے اور موڑ مڑتے ہوئے ہاتھ ہلا کر بولا۔ "جلدی سے چار فٹ کی قبر تیار کر دو"۔ اور یہ جا وہ جا۔ اللہ بخش کے ہاتھ سے حقہ لڑھک گیا۔ تھوڑا اُٹھتے ہوئے وہ پکارا "ارے سن تو" لیکن لڑکے نے مڑ کر پھر ہاتھ ہلایا اور پکارا۔ "جلدی کرو۔"

پھر تیزی سے آٹا گوندھتے کی طرح پیڈل مارتا نکل گیا۔

لمحہ بھر کو اللہ بخش کو غصہ آیا۔ مگر پھر ایکدم اُس پہ خوشی غالب آگئی۔ ساری رگوں میں ایک دم پھرتی جاگ پڑی۔ اور وہ کدال اٹھا کر قبرستان کے سرے کی طرف لپکا۔ زمین پہ کدال جما کر دونوں سروں پہ نشان لگایا۔ "یہ تین فٹ ہوئے"۔ وہ بولا۔ پھر کدال کا اگلا پھل ٹکا کر دوسرا نشان لگایا۔ "یہ پورے چار اور...... یہ ہوئی ایک بالشت" یہ نشان لگا کر اس نے ہاتھوں میں تھوکا۔ اور جب کدال اُٹھانے لگا تو ملول سا ہو گیا۔ "مولا جی سات روز بعد بھیجا بھی تو ایک دانہ ہی"۔ دانہ سے مراد بچہ کی لاش تھی۔ اور یہ چیز مایوس کن تھی۔ کیونکہ اللہ بخش کا زندگی بھر دستور رہا تھا۔ کہ بچے کی میت کی قبر کی کھدائی کے علاوہ اور کوئی بخشیش نہ لیا کرتا تھا۔

"جس گھر کا بوٹا ہی ٹوٹ گیا جی۔ اس کو اور کیا
توڑیں"

وہ اپنے واقف لوگوں سے کہا کرتا۔ اسلئے آج وہ زیادہ کر زیادہ پندرہ روپے لے سکتا تھا۔ جو بہت کم تھے۔ اپنی بیوی کو خرچ کے علاوہ شرفو کو پتنگ کے لئے بھی تو کچھ دینا تھا۔

اللہ بخش کے ہاتھ جھپا جھپ چلتے گئے۔ کدال سر پہ اُٹھا کر دونوں بازو پورے زور سے زمین پر مارتا۔ اور رکا ہوا سانس باآواز بلند چھوڑتا۔ ایک گھنٹہ میں اُس نے قبر تیار کر لی۔ پہلے کدال پہ جما جما کر مٹی باہر پھینکی اور پھر ہاتھوں سے سمیٹ سمیٹ کر باہر ڈالنے لگا۔ اب کام کی تیز رفتاری گزر جانے کے بعد اس کو تھوڑا تھوڑا غصہ آنے لگا۔ کہ صرف بچہ کیوں مرا۔ جبکہ اُسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ دل ہی دل میں جھنجھلاتا رہا۔ کہ اللہ کے کارخانے میں کیا بوڑھوں کی کمی تھی۔ جو عزرائیل کو بچہ ہی ملا۔ اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ بلا سے دانہ ہی ہو۔ لیکن آج تو میں بخشیش نہ چھوڑوں گا۔ جب مولا ہم پہ رحم نہیں کرتا۔ تو ہم دوسروں پہ کیوں کریں۔ یہ فیصلہ

کرکے اُس نے دھم سے کدال کو زمین میں دھنسا دیا۔ اور بڑے اعتماد سے چلم بھرنے لگا۔ اتنے میں بندو چاچا آتا دکھائی دیا۔ "اُدھری آجاؤ چاچا۔ چلم بھی تیار ہے"۔ اس نے ہاتھ ہلا کر پکارا۔ چاچا چلتا چلتا وہیں پہنچ گیا۔ اللہ بخش کش لگا رہا تھا۔ اس لیے بولا نہیں۔ بندو نے قبر کا جائزہ لیا اور بولا "قبر بن گئی ہے؟" - اللہ بخش نے اس غیر ضروری سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اور حقّہ کی نلکی بندو کی طرف موڑتا ہوا کھول کھول کرنے لگا۔ "آؤ بخشا ذرا شہر چلیں"۔ "واہ شہر کیسے چلیں۔ ابھی تو جنازہ آنیوالا ہے"۔ "ہاں ہاں وہ جنازہ ہی تو لانا ہے"۔ "کیا مطلب"۔

"اب کیا کہوں بخشا۔ اللہ کی رضا ہے۔ شرفو پتنگ اڑاتے اڑاتے کوٹھے سے گر کر مر گیا ہے۔ مَیں نے لڑکے سے کہا تھا کہ اللہ بخش کو نہ بتانا۔ مَیں خود ہی آکر بتاؤں گا"۔

اللہ بخش ایک دم سُن سا ہو گیا۔ اُسے پہلی دفعہ پتہ چلا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ وہ ایک دم چیخ مار کر اٹھا اور کدال اٹھا کر دھما دھم مٹی قبر میں گرانے لگا ——— ٭

مسیح الدین شاہد
(سال چہارم)

اب تو جاتے ہیں ۔۔۔۔۔!

ابھی تک وہ ایام آنکھوں کے سامنے ہیں۔ جب ہم طفلِ مکتب کی حیثیت سے اس عظیم درسگاہ میں داخل ہوئے۔

آہ! چار سال کا یہ عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا ——— زندگی کے بہترین چار سال — اب عنقریب ہم اس درس گاہ سے رخصت ہوا چاہتے ہیں۔ رخصت کے تصور سے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جدائی کے خیال سے دل بوجھل، طبیعتیں اداس اور آنکھیں اشکبار ہیں۔ ماضی کی حسین یادیں آج ذہن کے دریچوں میں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ یادیں ہماری زندگیوں کا جزو لاینفک بن چکی ہیں۔ کاش! ہم اس درسگاہ سے رخصت نہ ہوں۔ کاش لمحے پھیل کر صدیاں بن جائیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ بھلا کسی کے کہنے سے کبھی وقت کی رفتار بھی تھمی ہے؟

یہاں کے ماحول نے جو کچھ ہمیں دیا۔ یا جو ہم نے حاصل کیا۔ اس کی دلکش یاد ہمارے دلوں میں ابد تک ایک قندیل کی مانند روشن رہے گی۔ اور اس قندیل کی روشنی میں ہمارے قدم خود بخود منزل کی طرف اُٹھتے چلے جائیں گے۔

اے عزیزانِ ہم مکتب! ہم اپنی زندگی کے قیمتی سال گزار کر جُدا ہو رہے ہیں۔ جدائی کا دن ٹل نہیں سکتا۔ ہماری جگہ آپ لے رہے ہیں۔ اپنے تجربہ کی روشنی میں ہماری آپ سے فقط ایک گزارش ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ کامیابیاں آپ کے قدم چومیں۔ آپکا دامن خوشیوں سے بھر جائے۔ تو محنت کی عادت ڈالیئے۔ اپنے نیک ارادوں کو ایسے طور پر مستحکم کیجئے کہ آپکے پائے ثبات میں کسی قسم کی کوئی لغزش نہ آنے پائے۔ اپنے مقصد کو ہمیشہ سامنے رکھئے اور اپنی تمام کوششیں اس کے حصول کے لئے وقف کر دیجئے ٭

مبارک احمد طاہر
سال چہارم

(جائزہ)

آپ فارغ وقت کیسے گذارتے ہیں؟

زندگی عمل پیہم اور سعی مسلسل کا نام ہے۔ انسان ہر لحظہ کسی نہ کسی تگ و دو میں مصروف رہتا ہے۔ یہی تگ و دو اسے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرتی ہے۔

ہم سب طالب علم ہیں اور ہمارا اوّلین مقصد حیات اس وقت تعلیم حاصل کرنا ہے۔ صبح و شام ہمیں اپنے نصاب کی کتابوں سے واسطہ رہتا ہے۔ ہماری توجہ سارا سال اپنی نصابی کتب پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ تاہم ہمیں روزانہ چند لمحات ایسے بھی میسر آجاتے ہیں جنہیں ہم "فارغ لمحے" کہہ سکتے ہیں۔ ان لمحات میں ہم اپنی پسند کے مشاغل سے دل بہلا سکتے ہیں۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ ہر فرد کا ذوق دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اور وہ فارغ اوقات میں اپنے ذوق کی تسکین دوسرے افراد سے مختلف رنگ میں کرتا ہے۔ چنانچہ مجھے پچھلے دنوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں معلوم کروں کہ ہمارے کالج کے طلباء جب پڑھائی سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت وہ کیا کرتے ہیں، ان کے مشاغل کیا ہوتے ہیں۔ مطالعہ کے علاوہ ان کا وقت کس طرح گذرتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے قریباً ساٹھ طلبہ سے ملنے اور ان سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس ملاقات کے ذریعے معلوم ہوا کہ سترہ طلبہ کھیل کر اپنا وقت گذارتے ہیں۔ بارہ ناول پڑھکر، چھ اپنے ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچ کر۔ چار عبادت اور ذکر الٰہی کے ذریعے۔ تین باغبانی سے دل بہلا کر اور دو مذہبی کتب کا مطالعہ کر کے اپنا وقت بسر کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو طلبہ ہیں وہ افسانہ نویسی، غزل گوئی، کھیل کود، ورزش، سیر اور گپ بازی میں وقت گذارتے ہیں۔

اس جائزے کے سلسلے میں میری ملاقات سب سے پہلے ملک طارق بشیر سال چہارم سے ہوئی۔ ان سے جب میں نے اس بارے میں اظہارِ خیال کرنے کو کہا تو انہوں نے بے ساختہ جواب دیا "فارغ وقت ہوتا ہی کہاں ہے"۔ بعد میں جب میں نے وضاحت کی کہ پڑھائی کے علاوہ آپ کیا کرتے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ سائنسی تجربات کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کام میں اتنے محو رہتے ہیں کہ بعض اوقات تو کھانا کھانا بھی بھول جاتے ہیں۔ جو دوست طارق صاحب کے زیادہ قریب ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ آپ نے گھر پر ٹیلی ویژن بھی "ایجاد" کیا تھا اور غالباً ایک مرتبہ مختصر سا راکٹ بھی اڑایا تھا۔ ناولوں کے بارے میں استفسار پر انہوں نے بتایا کہ آج تک کوئی ناول نہیں پڑھا۔

کریم احمد نذیر سال دوم۔ نصیر احمد سال اوّل۔ وحید الدین عبید اللہ سال اوّل اور نعمت اللہ سال اوّل فارغ وقت میں کھیل سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔ یہ سب صاحبان "آؤٹ ڈور گیمز" کھیلتے ہیں۔ لیکن چند ایسے دوست بھی ہیں جو اپنا وقت "ان ڈور گیمز" میں صرف کرتے ہیں۔ ان کھیلوں میں "کیرم بورڈ" اور "لوڈو" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عمر حیات سال سوم لوڈو کے شوقین ہیں اور ذوالفقار علی داؤد سال سوم کیرم بورڈ پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ داؤد صاحب مطالعۂ اخبارات، کتب بینی، ریڈیو اور رومانی ناولوں کی "محفل" میں بھی وقت گذارتے ہیں۔

ہمارے ہاں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ ناولوں خصوصاً رومانی اور جنسی ناولوں کے ذریعے ہمارے بہت سے نوجوان صحیح راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ انہیں ایسے فحش لٹریچر سے نجات دلائی جائے۔ تاکہ ہماری نئی نسل اخلاقی تباہی سے بچ سکے۔ میں نے اس انٹرویو کے دوران اس بارے میں خصوصی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میرے اس جائزے کے مطابق

ہمارے طلبہ کا تقریباً چھٹا حصّہ اس عادت میں مبتلا ہے - یعنی بارہ میں کر تین طلباء رومانی اور جاسوسی ناولوں کا شوق فرماتے ہیں - ان میں ایسے طلباء بھی ہیں جو تاریخی ناول پسند کرتے ہیں -

ابرار احمد سال دوم بنیادی طور پر تو کھیل کے شوقین ہیں اور بقول خود بہت زیادہ کھیلتے ہیں - لیکن انہیں کا کہنا ہے کہ وہ رومانی ناول بھی زیر مطالعہ رکھتے ہیں - ضیاء الحق احمد سال دوم ، فاروق احمد سال دوم ، طاہر احمد خاں سال اوّل اور محی الدین مبشر سال اوّل بھی ناول پڑھکر فارغ وقت گذارتے ہیں -

عبدالغفور سال اوّل ، محمد رمضان سال اوّل اور ساحر حبیب سال چہارم عبادت - ذکر الٰہی اور دینی کتب کے مطالعہ میں اپنا فارغ وقت گذارتے ہیں - جبکہ خلیل احمد سال سوم ٹیبل ٹینس اور بیڈمنٹن شوق سے کھیلتے ہیں -

محمد انور سال چہارم کے طالبعلم ہیں - جب میں نے اُن سے یہ دریافت کرنا چاہا کہ وہ اپنا فارغ وقت کیسے گذارتے ہیں تو وہ قدرے ناراض ہوتے اور اسے اپنا "ذاتی معاملہ" قرار دے کر کچھ بتانے سے انکار کر دیا - بعد ازاں میرے اصرار پر بتایا کہ ان کا فارغ وقت کشتی رانی میں گذرتا ہے - یا پھر گھر بیٹھ کر ریڈیو سے گانے سنتے ہیں - انور صاحب کے علاوہ نعمت اللہ چیمہ سال سوم اور محمد آصف خاں سال چہارم بھی کشتی رانی کے شوقین ہیں -

ملک اقتدار چیمہ سال دوم بیان کرتے ہیں کہ ان کا فارغ وقت سوچ و بچار میں گذرتا ہے - ملک صاحب نے اپنی سوچ کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے - ایک "سوچ" وہ اکیلے کرتے ہیں - دوسری سفر کے دوران اور تیسری کالج میں - سفر میں آپ یہ سوچتے ہیں کہ دوسرے لوگ کیا سوچ رہے ہوں گے - اور کالج میں ہمیشہ آپ یہ سوچتے ہیں کہ ہر لڑکا اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ عقلمند کیوں تصور کرتا ہے ؟ اور اپنی کون خفیہ صلاحیتوں پر فخر کرتا ہے - خاص طور پر جب کوئی طالب علم اپنے دوستوں سے یہ کہتا ہے - کہ "میں ایک چکر چلا رہا ہوں" - اُس وقت ملک صاحب سوچتے ہیں کہ ابن صفی کے ناولوں کا کردار "عمران" ہمارے کالج میں کہاں سے آگیا ؟

"اقتدار صاحب! آپ تنہائی میں کیا سوچتے ہیں ؟" میرے اس سوال پر آپ نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا - اقتدار صاحب اگر "فلاسفی" پڑھتے تو شاید ایک اچھے فلاسفر بن سکتے - فلاسفر بننے کے بعد کسی نئے فلسفے کی تخلیق ان کے لئے چنداں مشکل نہ تھی -

امیر احمد سال چہارم اور عبدالحق رحمان سال دوم اپنے اوقات دینی کتب کے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں - سعید احمد چیمہ سال دوم اخبارات کھیل اور تاریخی کتب سے جی خوش کرتے ہیں - نعیم احمد سال سوم اور اور نصرت الٰہی سال سوم فارغ وقت میں ریڈیو سننا پسند کرتے ہیں اگر کوئی جاسوسی ناول مل جائے تو وہ بھی بڑے شوق سے پڑھتے ہیں - سعادت اللہ بھٹی سال سوم اپنا فارغ وقت نفسیات کا وسیع مطالعہ کرنے نیز چوہوں پر تجربے کرنے میں گذارتے ہیں -

اس سال کے بہترین ایتھلیٹ نور محمد سال چہارم کو جب کبھی فارغ وقت میسر آئے تو وہ ایتھلیٹکس کے علاوہ باغبانی بھی کرتے ہیں - آپ نے ایک مختصر سا باغیچہ تیار کر رکھا ہے جس کی نگرانی آپ بذات خود فرماتے ہیں - اس طرح ان کے ہاں اس قدر پیاز ، مرچیں اور ٹینڈے ہو جاتے ہیں کہ انہیں سبزی بازار سے نہیں خریدنی پڑتی - اگرچہ عبدالرشید بھٹی سال چہارم بھی باغبانی کا شوق فرماتے ہیں - لیکن یہ علیحدہ بات کہ انہوں نے آج تک کسی شے کی کاشت نہیں کی -

داؤد احمد سال چہارم اور فلاح الدین سال چہارم آپس میں دوست بھی ہیں اور ہمسائے بھی شاید یہی وجہ ہے - کہ ان دونوں کے مشاغل ایک جیسے ہیں - کھیل ، گپ بازی ، ریڈیو سننا اور شکار کھیلنا انہیں بہت مرغوب ہے -

مسعود احمد سال چہارم اور رانا محمود خاں سال چہارم ہوسٹل میں رہتے ہیں - ان میں سے مسعود صاحب تو ہوسٹل کے حالات پر تبصرہ اور سوچ بچار کے عادی ہیں - اور رانا صاحب اکثر یہ سوچتے ہیں کہ کالج کی مسجد کب بنے گی ؟ خدا کرے کہ ان کی یہ حسرت جلد پوری ہو تا کہ وہ کالج چھوڑنے سے پیشتر اس میں جی بھر کر نماز پڑھ لیں -

محمد اسمٰعیل لالی سال چہارم نے مرغیاں پال رکھی ہیں۔ آپ کا فارغ وقت مرغیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ محمد نواز لالی سال سوم فارغ وقت میں اپنے کھیتوں کی نگرانی فرماتے ہیں۔ سعید احمد سال اوّل لوڈو اور کیرم بورڈ کے کھلاڑی ہیں۔ محمد سلیمان سال سوم خود کو کرکٹ کا کھلاڑی سمجھتے ہیں۔

شریف احمد شاہد سال دوم کے بارے میں انکے دوست محمد اکرام نے بھی گواہی دی ہے کہ انہیں کبھی فارغ وقت نہیں ملتا عطاء اللہ باجوہ سال سوم کسی خاص مشغلہ کے عادی نہیں۔ جس طرح چاہیں اور جیسے حالات ہوں اسی طرح وقت گذار دیتے ہیں۔

نعیم قادر سال چہارم نے انکشاف کیا کہ وہ صحن کی صفائی میں وقت گذار دیتے ہیں۔ (واضح رہے کہ آپ نے نیا نیا مکان تعمیر کروایا ہے۔ اور صحن میں گڑھے بکثرت پائے جاتے ہیں) محمد انور سال چہارم اُبھرتے ہوئے سیاستدان ہیں۔ آپ کا اکثر وقت بقول آپ کے ملکی حالات پر تنقید و تبصرہ میں صرف ہوتا ہے۔ "سیاست" سے فرصت ملتے ہی آپ دوڑ لگاتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے۔ کہ دوڑ لگانا صحت کے لئے مفید ہے۔ اور اسی سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی شخص اچھی صحت کے بغیر اچھا سیاستدان نہیں بن سکتا۔

حلیم احمد سال سوم کھیل کر یا رسالوں کا مطالعہ کر کے وقت گذار دیتے ہیں۔ آپ ناول بھی پڑھتے ہیں۔ محمد افضل سال اوّل رومانی افسانے اور اردو ڈائجسٹ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

غور و فکر اور سوچ بچار کرنے والے دوستوں میں سے ظہیر الدین منصور احمد سال اوّل کا نام قابل ذکر ہے۔ آپ ٹھوس بنیادوں پر تعمیری رنگ میں سوچنے کے عادی ہیں۔ آپ اگرچہ میڈیکل کے طالب علم ہیں تاہم اپنے نصاب کی کتب سے زیادہ دینی و قومی مسائل پر غور و فکر میں مگن رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ آپ اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچتے رہتے ہیں۔ حفیظ احمد سال دوم نے بتایا کہ جب آپ فارغ ہوتے ہیں تو "شیخ چلی" کی طرح خیالی پلاؤ پکاتے ہیں۔ یا پھر شام کے وقت (MORNING WALK) میں وقت گذار دیتے ہیں۔ سلیم احمد سال اوّل بھی اکثر سوچ میں گم رہنے کے عادی ہیں۔ لیکن باوجود کوشش کے یہ نہیں بتا سکے کہ آپ کیا سوچتے ہیں؟ خدا کرے۔ اُن کی سوچ مثبت ہو!

عاصم صحرائی سال سوم نے بائیں ہاتھ سے سر کھجاتے ہوئے کہا "در اصل بات یہ ہے کہ میرے مشاغل میں عجیب بے ربطی پائی جاتی ہے۔ میں خود بھی انہیں مربوط نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ میں "ورائٹی" کا قائل ہوں۔ میں نے خود کو کبھی وقت کا غلام نہیں سمجھا بلکہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وقت میرا غلام ہے۔ صحرائی صاحب کا عقیدہ ہے کہ انسان کو حلقۂ شام و سحر سے نکل کر جاوداں ہو جانا چاہیئے۔ اسی لئے آپ اکثر راتوں کو جاگتے ہوئے اور دن کے وقت سوتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ دوران گفتگو یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حضرت فقط چائے کی ایک پیالی پر پورا دن ٹرخائے جا سکتے ہیں۔ ان کے ایک دوست ابن السلام کا کہنا ہے کہ صحرائی صاحب کو صحرائے ابی سینیا میں چائے کے کئی ایک تھرماس دیکر چھوڑ آنا چاہیئے۔ جہاں یہ سارا دن شعر کہتے رہا کریں۔

عرفان احمد سال دوم ہاکی یا باسکٹ بال کھیلنے میں گزارتے ہیں۔

مسرور احمد باجوہ سال چہارم نے بتایا کہ جب وہ کورس کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اکتا جاتے ہیں تو دل بہلانے کے لئے اپنی جمع شدہ تصاویر دیکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف وقت کٹ جاتا ہے بلکہ ان کے ذہن میں ماضی کی حسین یادیں دوبارہ تازہ ہو جاتی ہیں۔

مطلوب احمد سال چہارم غالباً سب سے زیادہ عمر رسیدہ طالب علم ہیں اور بہت کم گفتگو کرتے ہیں۔ آپ نے بتایا۔ کہ "میں تمام اخبارات کا مطالعہ کرتا ہوں"۔ "آپ کو سب سے زیادہ کونسا اخبار پسند ہے"؟ اس سوال کے جواب میں مطلوب صاحب نے مسکرا کر نہایت دھیمی آواز سے کہا "اخبار خواتین"۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر شرما گئے۔ جیسے میں نے ان کی کوئی چوری پکڑی ہو۔

ہمارے ہاں ادبی ذوق اور شعر و شاعری سے لگاؤ رکھنے والے طلباء کی بھی کمی نہیں۔ ٹی۔ اے محمود سال اوّل فارغ وقت

ہیں۔ ناول نویسی کرتے ہیں۔ انگریزی ناول آپ کا من بھاتا کھاجا ہے۔ شاید تو اب مخدوم سال چہارم خود کو شاعروں کی فہرست میں شمار کرتے ہیں۔ آپ کا فارغ وقت شعر گوئی کی نذر ہو جاتا ہے۔ میری فرمائش پہ آپ نے اپنی ایک تازہ غزل ارشاد فرمائی۔ ایک شعر آپ بھی سنیئے۔ ؎

غنچہ سی بن کے رہ گئی کتنے دلوں کے پار
تیری نگاہِ ناز نے دل خون کر دیا

اب میں ایک ایسے طالب علم کا ذکر کرتا ہوں کہ جن کا وجود "اپنی مدد آپ" کی بہترین مثال ہے۔ ہم میں سے بہت سے طلباء ان کی تقلید کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ طالبعلم محمد صادق سال اوّل ہیں۔ آپ فارغ وقت میں کسی ایسے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں جس سے وقت بھی گذر جائے اور آمدنی کی صورت بھی پیدا ہو۔ مثلاً صادق صاحب نے بتایا کہ فارغ وقت میں آپ اکثر روغن وغیرہ کر کے اپنے تعلیمی اخراجات کا بیشتر حصہ خود ہی پورا کر لیتے ہیں۔

نعیم احمد سال سوم نے بڑے عجیب "موڈ" میں فرمایا۔ کہ انہیں فارغ وقت نہیں ملتا۔ انہوں نے کہا کہ کالج سے جاتے ہی میں درسی کتب میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ "کیلکولس" (CALCULUS) کے بعد الجبرا پڑھتا ہوں۔ الجبرے کے بعد "سولڈ جیومیٹری" پھر ماڈرن فزکس اور اس کے بعد "لائٹ" اور یونہی دن ختم ہو جاتا ہے۔ "ساؤنڈ" پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔

محمد اسحاق سال اوّل ماضی کے دریچوں میں جھانک کر وقت گذارتے ہیں۔ منصور احمد خاں سال دوم برنگ کھیل کر اور محمد ظفر اللہ اسلم سال چہارم سیر کر کے وقت گذار دیتے ہیں۔ بشیر الدین سال چہارم سے بات چیت کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ آپ دل پہ چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ آپ اکثر زندگی کی تلخ حقیقتوں کا مطالعہ کرتے رہنے کے عادی ہیں۔ یا پھر مستقبل کے پروگرام مرتب کرنا آپ کا بہترین مشغلہ ہے اپنے خیال کو آپ نے اس شعر سے واضح کیا۔ ؎

مجھ کو خود اپنی جوانی کی قسم ہے کہ یہ عشق
اِک جوانی کی شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں

محمد حنیف سیف سال چہارم نے بڑے رازدارانہ لہجہ میں بتایا کہ انہیں اپنی ظاہری خوبصورتی کے سوا کسی اور شئے سے چنداں سروکار نہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ سب سے زیادہ حسین نظر آئیں۔ یہیں ممکن ہے کہ وہ ایمکس (EMEX) کے استعمال سے بھی دریغ نہ کرتے ہوں۔ حنیف صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ آپ چہرے کے کس حصہ کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ "میں اپنی مونچھیں سنوارنے پر سب سے زیادہ وقت صرف کرتا ہوں"۔ آپ کی مونچھیں غیر معمولی طور پر باریک ہیں۔

اس جائزہ کے دوران طلبہ کی اکثریت نے خاکسار سے بھی پوچھا میاں! تم بھی تو کچھ کہو۔ تمہارا فارغ وقت کیسے گذرتا ہے۔ ایسے تمام دوستوں کی خدمت میں المنار کی وساطت سے عرض ہے کہ شادی خانہ آبادی کے بعد زندگی اسقدر مصروف ہے کہ فارغ وقت ملتا ہی نہیں۔ وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔

"ایک صاحب سمندر کے کنارے تفریح کی غرض سے کار چلا رہے تھے۔ دفعتاً انہوں نے ایک شخص کو سمندر میں ڈوبتے ہوئے پایا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً بریکیں لگا کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ڈوبنے والے کو بچا کر کنارے پر لانے کے بعد جب وہ اپنی کار کی طرف گئے تو انہوں نے کار کے پاس قانون کے ایک محافظ کو کھڑے پایا۔ کیونکہ کار غلط جگہ پارک کرنے کے الزام میں ان کا چالان ہو چکا تھا"۔

ڈاکٹر نصیر احمد خاں

لالے میں کب کہاں کسی سرو دہن میں تھی
وہ رو در رنگ و بو کی جو گل پیرہن میں تھی

پھر کیا ہوا کہ فصلِ گل آئی ہمارے بعد
دوشِ صبا پہ خاک تو اپنی چمن میں تھی

ہم کب ہنسے کہ دیدۂ بینا نہ رو پڑا
کچھ بے بسی بھی اپنے رخِ خندہ زن میں تھی

جُل دے گئی چراغِ خرد کو ہزار بار
"وہ تیرگی جو زلفِ شکن در شکن میں تھی"

دل کیا دیا کہ ایک زمانے سے ٹھن گئی
کس کس کی لاگ تھی کہ تمہاری لگن میں تھی

گویا ہوئے تو کوثر و تسنیم بہ پڑے
اک موجِ سلسبیل کی شیریں دہن میں تھی

شبنم کو چھیڑ آئی کہیں عندلیب کو
کیا محوِ ناز بوئے گل اپنے چمن میں تھی

بارِ خرد سے ہم تو سبکدوش ہو گئے
اک بے خودی کی لہر تری انجمن میں تھی

کھلتے ہیں یوں تو لالہ و گل ہر جگہ ندیم
لیکن کہاں وہ بات جو اپنے چمن میں تھی

کیا کیا پڑے ہیں لعل و گہر خاک میں نہاں
ارزاں ابھی ہے جنس جو کشتِ وطن میں تھی

منصور بھی کھنچے چلے آئے نصیر بھی
حیراں ہوں کیا کشمکش تھی کہ دار و رسن میں تھی

مُبارک احمد عابد۔ایم۔اے

رُوحِ فطرت میں سُلگتے اک شرر کی بات ہے
عاشقی کس نے کہا قلب و نظر کی بات ہے

دل لگا کر بھول جانا یہ کوئی آساں نہیں
ایک دو دن کی نہیں یہ عمر بھر کی بات ہے

مَیں نے جب اس کو سنایا قصّۂ مہر و وفا
اُس نے پوچھا یہ کہاں کی کس نگر کی بات ہے

چھیڑتا ہے جب کوئی بھی داستان کہکشاں
سوچتا ہوں یہ تمہاری رہگزر کی بات ہے

دوسروں کو کیا بتائیں دل کے لٹنے کا سبب
کون بتلاتا کسی کو اپنے گھر کی بات ہے

غم کی ان خاموش لہروں میں ہے طوفانِ سخن
آنسوؤں کی خامشی ہی چشمِ تر کی بات ہے

خونِ دل کی آبیاری سے نکھرتی ہے غزل
شاعری کرنا بھی عابد دل جگر کی بات ہے

○

شمع تیری یاد میں، مَیں نے جلائی دیر تک
پر ترے انفاس کی خوشبو نہ آئی دیر تک

مَیں نے دیکھا غور سے لیکن وہاں پہ کچھ نہ تھا
مَیں نے یونہی ذہن میں صورت بنائی دیر تک

ہر کوئی اب تو یہاں پر بدگماں ہونے لگا
مَیں نے جس کے سامنے کی جبّہ سائی دیر تک

دل کے آنگن میں تجھے دیکھا ہے مَیں نے بارہا
میری آنکھوں میں تری صورت سمائی دیر تک

وہ بھی کل دیکھا کئے عاصمؔ تجھے ہی بار بار
تیرے دل پر بھی رہی مستی سی چھائی دیر تک

(عاصم صحرائی)

ستید محمود سلیم۔
سال سوم

اب اشکِ غم اگر نہ بہائیں تو کیا کریں
تنہائیوں میں یاد وہ آئیں تو کیا کریں

ٹھکرا دیا ہو دیر و حرم نے جنہیں ندیم
وہ مے کدے سے لَو نہ لگائیں تو کیا کریں

یہ بھولنا ہمارا مبارک انہیں مگر
لیکن ہمیں وہ یاد جو آئیں تو کیا کریں

دُنیا بھی اک فریب ہے، الفت بھی اک فریب
الفت کا پھر فریب نہ کھائیں تو کیا کریں

تجھ بن جہاں میں جن کا سہارا نہ ہو کوئی
وہ حالِ دل تجھے نہ سنائیں تو کیا کریں

اپنا اگرچہ سب کو سمجھتے پھریں سلیم
اپنا اگر کسی کو نہ پائیں تو کیا کریں

محمد حسین شمیم
سال سوم

جو یُوں ہوتا کہ اپنا سر تمہارا آستاں ہوتا
تو کتنا مختصر سا اپنی الفت کا جہاں ہوتا

کبھی حرفِ شکایت لب پہ ہم لاتے تو مجرم تھے
اگر تم مہرباں ہوتے، فلک نامہرباں ہوتا

بھلا اچھا ہوا کوئی نہیں تھا آشیاں اپنا
وگرنہ ہر گھڑی اندیشۂ برقِ تپاں ہوتا

بذاتِ خود تمہارا حُسن وجہِ بدگمانی ہے
نہ تم اتنے حسیں ہوتے نہ میں یوں بدگماں ہوتا

انہی دو حسرتوں پر اب مدار زندگانی ہے
کبھی اک آشیانہ تھا، کبھی اک آشیاں ہوتا

ملا راہِ محبت میں ہمیں جو بھی وہ تھا ناصح
کوئی تو ہم زباں ملتا کوئی تو رازداں ہوتا

شمیم اب رو رہے ہو کس لئے کیا ہم نہ کہتے تھے
اگر پہلے سنبھل جاتے تو کیوں دل کا زیاں ہوتا

(محمد یار کلیم ۔ سال سوم)

پھر اُن کی نگہ ناز کا احساں ہے آجکل
پھر مجھ کو فکر گردشِ دوراں ہے آجکل

وہ دن گئے کہ مجھ کو بیاباں کی تھی تلاش
تیرے بغیر گھر ہی بیاباں ہے آجکل

کیسا مذاق، کس کی جدائی، کہاں کا ہجر؟
اتنا ہے بس وہ آنکھ سے پنہاں ہے آجکل

اے موت تو کہاں ہے ۔ کیا سن رہا ہوں میں
کیوں میرے حال پر وہ پشیماں ہے آجکل

وائے نصیب اتنی بھی اب تو خبر نہیں
کس حال میں وہ جانِ بہاراں ہے آجکل

اے کاش کوئی اس بتِ کافر کو دے پیام
تجھ بن ترا کلیم پریشاں ہے آجکل

(بشیر طارق ۔ سال اول)

جب کلی کوئی مسکرائی ہے
کیوں مجھے تیری یاد آئی ہے

جب خوشی کی کوئی جھلک دیکھی
غم کی آندھی بھی ساتھ آئی ہے

خواہشِ مرگ پر ہمیشہ ہی
زندگی مجھ پہ مسکرائی ہے

ہاتھ میں جامِ زندگی تھامے
موت بھی مسکرا کے آئی ہے

جام و مینا کی بات رہنے دو
زلف و عارض کی بات آئی ہے

زندگی تو کسی کے نام سے تھی
موت بھی آج سے پرائی ہے

محمد احسن گردیزی ۔ سال اول

جو بھی دنیا میں تھا باوفا اُٹھ گیا
اب تو دنیا سے یارو مزا اُٹھ گیا

ہم سفر غور کر سوچ خود ہی ذرا
ناخدا ہے اٹھا، کیا خدا اُٹھ گیا

تیری محفل میں بے مدعا آ گیا
تیری محفل سے بے مدعا اُٹھ گیا

دل میں سوئی ہوئی آہ کی طرح تھا
میں فضاؤں میں بن کر صدا اٹھ گیا

بے نوائی بھی جس کی عجب چیز تھی
جگ سے وہ احسن بے نوا اُٹھ گیا

شریف نیازی ۔ سال اول

آئے وہ انجمن میں تو منہ پہ نقاب تھا
بادل میں چھپ گیا تھا۔ مگر ماہتاب تھا

یوں دیکھتے ہی اس نے مرا خط اُلٹ دیا
جیسے کتاب عمرِ گزشتہ کا باب تھا

محسوس وقتِ مرگ کچھ ایسا ہوا مجھے
جیسے کہ زندگی کوئی رنگیں خواب تھا

گزری تمام عمر مری اس طرح شریف
تسبیح تھی یا ہاتھ میں جامِ شراب تھا

منوّر احمد انیس
سال سوم

انیسؔ کے نام

میاں! خط تمہارا پہنچا ۔ صد سالہ برسی میں شرکت کی بھی خوب کہی ۔ ارے صاحبزادے کس کی بکری کون ڈالے گھاس؟ میں پوچھتا ہوں کیا سو برس بیتنے کے بعد ہی تمہیں میرے اشعار کے معنی سمجھ آئے ۔ جیتے جی تو ہم شاہ کی وظیفہ خواری کیا کیئے اور ناقدریٔ عالم کا رونا تھا کہ :۔ ع

مر گئے ہم نے تو زمانے نے بہت یاد کیا

سو یہ بات تم نے اب پوری کر دکھائی ۔

اگلے وقتوں کی کیا کہوں کہ نہ کوئی غمگسار تھا نہ چارہ ساز اب جو تم نے گڑے مردے اکھاڑے ہیں تو کس کام — ؟ اسے کہتے ہیں جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسنا ۔

اس کنج خرابی کا احوال واقعی تم سے کیا کہوں کہ وہ تو میں پہلے ہی کہہ آیا تھا ۔ ؎

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنّت کو کیا کرے کوئی

اور اب تو یہ حالت ہے ۔ کہ ع

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

کلیجہ نہیں کہ دوبارہ اس جا آ بیٹھوں کہ جس جا سے بے آبرو ہو نکلا اور اس جگہ طبیعت متغض ہے ۔ شاکیٔ ارباب جفا ہوں ۔ یہاں کے ماحول کے سبب ذہن پر عالم قبض طاری ہے کہ ایک مصرعۂ تر کی صورت بھی نکلتی دکھائی نہیں دیتی ۔ سو تمہیں اپنا کلام تازہ کیا بھیجوں ۔؟

اور میاں کس سنٹے میں پڑے ہو ۔ چھوڑ دیہ دھندے تہ خاک تو دبا چکے اب ۔ ع

"پر اکثر یاد آتا ہے"

کا بھڈّا کرنے سے فائدہ — ؟ آخر اور بھی تو ہو گزرے ہیں ۔ یاد ہے ۔ کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا ۔

سو میاں! یاد کرو تو ان اگلے وقتوں کے لوگوں کو ۔ ہم بادہ خواروں سے عذرِ مستی رکھکر کیوں چھیڑتے ہو ۔ ہم سے تمہیں کیا نسبت — ؟

میاں تمہارے ان ہنگاموں سے بھلا مجھے کیا خوشی ہو کہ میں تو کہہ چکا ہوں ۔ ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ

جو جی میں آیا کہہ گئے ۔ اب تم جو داد کے ڈونگرے برساتے ہو تو کیوں — ؟

اور ہاں دیکھو — ! میری ان کڑوی کسیلی باتوں کا بُرا مت ماننا ۔ تم نے جو چچا کہکر پکارا ہے تو بھتیجے بن کر کچھ سن بھی لو ۔ یہی کہتا ہوں کہ ملی ملی کیا کرو اور فارغ البالی رہا کرو ۔

تمہاری خوشی کا طالب ۔
غالبؔ

"غالب خوش قسمت تھے کہ انہیں ہمدرد شارحین مل گئے ۔ ایک پٹھان مدرّس نے بھی اس قسم کے کچھ معرّب اور مفرّس شعر پشتو میں کہے تھے ۔ جب اُسنے ایک پٹھان دیہاتی کو سنائے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ۔ اسنے پوچھا "یہ کس کے شعر ہیں ؟" جواب دیا "حقیر کے" اسنے کہا "خدا تجھے اور حقیر کرے ۔ یہ پشتو ہے یا قرآن شریف" ۔

(کیانی)

طنز و مزاح

اِدھر اُدھر سے

○ مجبوری

ایک مسافر کسی گاؤں میں رات گذارنے کی غرض سے مسجد میں ٹھہرا۔ اُس نے محراب میں ایک حُقّہ دیکھا۔ مسافر بڑا حیران ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر ایک دیہاتی سے پوچھ بیٹھا۔ بھئی اس حقّہ کا یہاں محراب میں کیا مصرف ہے؟ دیہاتی نے جواب دیا۔ "ہمارے مولوی صاحب کبھی کبھی پیا کرتے ہیں۔ مسافر نے اور زیادہ حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "وہ کیوں؟" "جی! وہ پیتے تو چرس ہیں۔ مگر جب چرس نہ ملے تو حقّے کا کش لگا لیتے ہیں۔" دیہاتی نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "دراصل وہ عادی تو شراب کے ہیں۔ چرس کے نہیں"۔ مسافر نے کہا۔ یعنی تمہارے مولوی صاحب شراب بھی پیتے ہیں۔ نہایت واہیات ہیں تمہارے مولوی صاحب۔ دیہاتی نے مسافر کو غصّے میں دیکھا تو بڑی نرمی سے بولا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ شراب کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی ہے — اور مولوی صاحب اتنی رقم کے روز متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے وہ شراب اس وقت پیتے ہیں جب انہیں جُوا کھیلتے ہوئے کافی رقم مل جائے"۔ اچھا تو تمہارے مولوی صاحب جُوا بھی کھیلتے ہیں"۔ مسافر مشتعل ہو گیا۔ "تم ایسے ذلیل انسان کو اقتدا کے لئے کھڑا ہی کیوں کرتے ہو؟" دیہاتی نے نہایت مختصر سا جواب دیا۔ "جناب! مجبوری کا ہے۔ اگر پیچھے کھڑا کریں تو مولوی صاحب جوتے اٹھا کر بھاگ جاتے ہیں"۔

○ نہلے پہ دہلہ

"آجکل دھلی برتن بھی مشینوں سے دھوئے جاتے ہیں۔ اور جھاڑو دینے کا کام بھی مشینیں ہی کرتی ہیں"۔ لندن سے واپس آکر اختر نے اپنے دوست اصغر سے کہا۔ اصغر نے کہا۔ "بھئی اس میں کونسی تعجب کی بات۔ میں نے لندن میں اپنے قیام کے دوران ایک ایسی مشین دیکھی تھی کہ اگر اس میں زندہ گائے کو ڈال دیا جائے تو دوسری طرف سے پالش کئے ہوئے سلے سلائے تیار شدہ بوٹ مل سکتے ہیں"۔ اختر نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اصغر نے کہا۔ "مزید یہ کہ اگر گائے چوری کی ثابت ہو جائے تو فوراً مشین میں بوٹ ڈال کر جونہی مشین کی دوسری کل گھماتے ہیں گائے اپنی پہلی حالت میں ڈکارتی ہوئی باہر نکل آتی ہے"۔

(سید محمود سلیم)

○ اشتہار عام

(مژدہ برائے مالکانِ رومالہائے گمشدہ گان)

عرصہ چھ ماہ کی بات ہے مجھے گولبازار سے ایک گمشدہ رومال ملا تھا۔ چونکہ اس وقت میرے پاس کوئی اور رومال موجود نہ تھا اس لئے اس رومال کو اب تک استعمال کرتا رہا ہوں (اور اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں)۔

اب چونکہ مجھے اس سے اچھا رومال رحمت بازار سے پرسوں کھلے میدان سے مل گیا ہے۔ نیز پہلے رومال کی حالت بھی خستہ سی ہو گئی ہے۔ لہٰذا اس اعلان کے ذریعے میں پہلے رومال کے مالک کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ مذکورہ بالا رومال میرے پاس محفوظ پڑا ہے (یعنی گول بازار والا رومال) جس صاحب کا ہو وہ حسب ذیل سوالات کے صحیح جوابات دیکر یہ رومال حاصل کر سکتا ہے:-

(۱) آیا یہ رومال آپ ہی کا ہے؟ (حلفیہ بیان دیں)

(۲) رومال سوتی ہے یا ریشمی؟

(۳) اس کا رنگ اور ڈیزائن بتائیں۔ سابقہ اور موجودہ دونوں۔

(۴) جب یہ رومال آپ نے گم کیا تو یہ دھلا ہوا تھا یا نہیں۔ اگر دھلا تھا تو کس نے دھویا تھا اور اگر نہیں تو کیوں؟

(۵) یہ رومال آپ نے گم کیوں کیا؟

(۶) کیا آپ دوسری چیزوں کی حفاظت کے معاملے میں بھی اتنی ہی غفلت برتتے ہیں۔ بتایئے آپ کو اس جرم کی پاداش میں کیا سزا دی جائے (سزا واضح طور پر تجویز کریں)۔

(۷) کیا آپ نے یہ رومال (ا) اپنی گرہ سے خرچ کر کے خریدا تھا۔ (ب) کسی نے تحفہ میں دیا تھا یا پھر (ج) آپ کو بھی گرا پڑا ملا تھا۔ (اگر اس سوال کے حصہ ج میں آپ کا جواب اثبات میں ہے تو آپ بیشک اسے حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں)

(۸) یہ رومال پہلے بھی کبھی گم ہوا تھا یا نہیں۔ اگر گم ہو، تھا تو کب اور کتنی مدت کے لئے؟

نوٹ:۔ سب سوالات کے جوابات تحریری طور پر آنے چاہئیں۔ نیز پرچہ جوابات پر پندرہ ۱۵ پیسے کے ڈاک ٹکٹ چسپاں کئے جانے ضروری ہیں۔ ورنہ درخواست پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اگر ایک سے زیادہ امیدواروں کے جوابات درست نکلے تو ان میں رومال برابر حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ جوابات تین دن تک زیر دستخطی کو مع درخواست اجرائے رومال کے پہنچ جانے چاہئیں۔

میرے دوست جو اس رومال کو کئی بار دیکھ چکے ہیں درخواست دینے کا حق نہیں رکھتے۔ **المشتہر**

خاکسار، قمر الزمان ریٹائرڈ انسپکٹر تمباکو

ہمنڈوال روڈ ڈوبہ ٹیک سنگھ حال فیکٹری ایریا ربوہ

"ہمارے تیسرے کرم فرما کسی سکول میں مدرس ہیں۔ آپ کا تکیہ کلام ہے۔ "میں پوچھتا ہوں آپ کے پاس یہ چیز ہے؟" چنانچہ آپ بجائے بازار۔ ڈاک خانہ یا ہسپتال جانے کے وقتاً فوقتاً ہمارے پاس تشریف لے آتے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں آپ کے پاس ایک گولی کونین کی ہے؟ ایک آنے کا ٹکٹ ہے؟ پرسوں کا اخبار ہے؟ پچھلے سال کا کیلنڈر ہے؟ اس سال کی جنتری ہے؟ پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اقبال کے اشعار کا انتخاب ہے؟ وغیرہ وغیرہ سوالوں سے ہمارا ناک میں دم کیا کرتے ہیں۔ ایک دن نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگے۔ میں پوچھتا ہوں۔ آپ کے پاس ادب لطیف کا سالنامہ ہے؟ میں نے کہا کیوں؟ اس کی کیا ضرورت پیش آئی"۔ کہنے لگے۔ یونہی کچھ نہیں۔ اس میں سے ہارلکس کا اشتہار پڑھنا تھا"۔

(کنہیالال کپور)

داؤد محشر
سال دوم

محشر کی جدید لغت

شادی ۔ وہ سنہری پنجرہ ہے جس میں انسان بڑی آرزوؤں کے ساتھ داخل ہوتے ہی باہر نکلنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔

شرافت ۔ مجبور لوگوں کا سہارا جو طاقت وردں کے لئے غیر ضروری ہے۔

شرم ۔ بزدلی کا دوسرا نام جس کے باعث چلو بھر پانی میں غوطہ زنی کی جا سکتی ہے۔

پریفیکٹ ۔ جو ہر ساتھی طالب علم پر رعب جھاڑنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔

رکشا ۔ وہ سواری جو ہاضمون سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

چمچہ ۔ ایسے طالبعلم کا خطاب جو استاد کا فرمانبردار ہو۔

حجامت ۔ پہلے صرف حجام کی دکان پر ہوتی تھی۔ اب ہر دکان پر ہو جاتی ہے۔

خادم ۔ ووٹوں کا طلبگار۔

رزلٹ کارڈ ۔ نامۂ اعمال۔ مورد قہر و جلالِ پدری

سائیکل ۔ اگر کرایہ کی ہو تو "کم خرچ بالا نشین" سواری ہے۔

سائیکل اسٹینڈ ۔ جہاں سائیکلیں غسلِ آفتابی کرتی ہوئی دم توڑ جاتی ہیں۔

کمپارٹمنٹ ۔ آسان قسطوں میں سند حاصل کرنے کا واحد ذریعہ۔

اختلاج ۔ مشکل پرچے کا ردِ عمل۔

ایڈیٹر ۔ وہ بدنصیب شخص جس پر دوسرے لوگ رشک بھی کرتے ہیں۔ اور تنقید کے نشتر بھی چبھوتے ہیں۔ (جیسے شاباش کم اور جھڑکیاں زیادہ ملتی ہیں)۔

دفتر ۔ گپیں ہانکنے کا مرکز

قانون ۔ مکڑی کا جالا جس میں صرف چھوٹے کیڑے پھنستے ہیں۔

مرحوم ۔ جس کے واپس آنے کا کوئی ڈر ہو نہ خدشہ۔

لائبریری ۔ کتابی کیڑوں کی آرام گاہ

اڑوٹ انگ ۔ کسی سے کوئی چیز لے کر واپس نہ کرنا۔

"ابھی مشن کالج ڈگری کالج نہیں بنا تھا۔ نیگسن صاحب پرنسپل تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے کہا کہ کالج کے وقت کے پہلے مجھے عربی پڑھا دیا کیجئے۔ شاہ صاحب ان کو عربی پڑھانے لگے۔ چند ابتدائی سبق پڑھانے کے بعد انجیل پڑھانے لگے۔ صاحب بڑا لطیفہ باز تھا۔ پڑھتے پڑھتے کہیں اذان کا لفظ آگیا تو بولا۔ مولوی صاحب ایک بات پوچھتا ہوں۔ خفا نہ ہونا۔ یہ کیا بات ہے کہ آپ کے خدا کو جب تک پانچ مرتبہ نہ پکارا جائے۔ وہ سنتا ہی نہیں۔ شاہ صاحب نے کہا جی ہاں ہمارا خدا ایسا نہیں کہ ہر آٹھویں دن ٹن ٹن کی آواز سن کر خوش ہو جائے۔"

(عبدالمجید سالک)

عبدالکریم خالد
سال اوّل

طولِ شبِ فراق ذرا ماپ دیجئے

ریاضی دانوں سے معذرت کے ساتھ

اسکول کے زمانے میں ہم ریاضی پڑھا کرتے تھے - لیکن اس میں ہم بالکل کورے تھے - پانچویں جماعت تک جمع تفریق کے سوال آسانی سے حل کر لیا کرتے تھے - لیکن جب اس کے بعد کلیات کی بھرمار شروع ہوئی - نیز سلیٹ اور تختی کی بجائے کاپی کے اَن گنت اوراق ہمارے سامنے پھیل گئے - جنہیں ہم گھنٹوں بیٹھے سیاہ کیا کرتے مگر جواب ٹھیک آنے کا نام ہی نہ لیتا تھا - تو مجبوراً ہمیں ٹیوشن رکھنا پڑی - آخر فیصلہ یہ ہوا کہ ہم ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے روزانہ بلاناغہ ماسٹر صاحب کے درِ دولت پر حاضری دیا کریں - اور اُن سے سوال سمجھا کریں -

چند شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی - کہ مہینے کے آخر میں ہم کچھ رقم بطور نذرانہ دیا کریں - قصہ مختصر اگلے دن ہم ماسٹر صاحب کے دولت خانہ پر جبہ سائی کے لئے جا پہنچے - ماسٹر صاحب کا ایک الگ کمرہ تھا - مین اسٹورنما - جہاں وہ بیٹھکر ریاضی کی گتھیاں سلجھایا کرتے تھے - یہ کمرہ روشندان اور کھڑکیوں سے بالکل بے نیاز تھا - تھوڑی دیر بعد ماسٹر صاحب ایک ٹیبل فین اُٹھائے ہوئے کمرے میں نمودار ہوئے - پنکھے کی ہیئت کذائی سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ انہیں ورثے میں ملا ہے - یا کسی کباڑیئے سے خریدا تھا - پنکھا دیکھتے ہی ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی - ہم نے سوچا ماسٹر صاحب ہم پر کتنے مہربان ہیں - صرف ہمارے لئے پنکھا لانے کی زحمت گوارا کی - مگر جب وہ پنکھے کا رُخ اپنی طرف موڑ کر اطمینان کر کرسی پر بیٹھ گئے تو ہمارے منہ لٹک کر رہ گئے -

تھوڑی دیر بعد ماسٹر صاحب بولے - "اچھا بھائی اگر آ ہی گئے ہو تو لکھو ایک سوال - ہمیں پہلی بار اندازہ ہوا - کہ ماسٹر صاحب نے ہماری آمد سے کوئی خوشگوار تاثر قبول نہیں کیا - ماسٹر صاحب نے گلا صاف کرتے ہوئے ایک سوال کی عبارت یوں لکھوائی :-

"فرض کرو پہلا گدھا تین بالٹی - دوسرا گدھا دو بالٹی اور تیسرا گدھا (جو غالباً گدھے کا بچہ ہوگا) ایک بالٹی پانی پیتا ہے - اب اگر گڑھے میں صرف چار بالٹی پانی ہے - تو اُن گدھوں کو کس تناسب سے پانی پینا چاہیئے"

یہ سوال سُن کر ہم یوں چونکے جیسے اچانک نیند سے بیدار ہوتے ہوں - ماسٹر صاحب نے ہمیں تاڑ لیا - ہم نے ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کی - تو ماسٹر صاحب نہایت رعب دار آواز میں گرجے - "یہاں نقل وقل نہیں چلے گی - اپنا اپنا سوال حل کرو" - ہم نے سوچنا شروع کیا - کہ اگر ان گدھوں میں تناسب کا شعور ہوتا - تو وہ پانی کا جھگڑا کھڑا کرنے کی بجائے ریاضی کے مشکل سوال حل کرتے -

ہم دیر تک اِسی خیال میں سرگرداں رہے - لیکن کوئی کارآمد نتیجہ برآمد نہ کر سکے - جب کچھ پیش نہ گئی - تو ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں مشورہ کرنے لگے - متفقہ فیصلہ یہ ہوا کہ جو گدھا سب سے زیادہ طاقتور ہوگا وہ دوسروں کو دولتی مار کر بھگا دے گا - اور اپنی پیاس بجھا لے گا - لیکن توبہ کیجئے ماسٹر صاحب اس قسم کے جواب سے کہاں مطمئن ہونے والے تھے - انہیں تو تناسب چاہیئے تھا - وہ اپنے تناسب پر ڈٹے رہے - اور اِدھر ہمارے

حلق خشک اور زبانیں تالوؤں سے چمٹی رہیں۔ زبانیں بار بار ہونٹوں سے مس ہوتیں۔ لیکن ناکام واپس لوٹ آتیں۔ جسم تھے کہ پسینے سے شرابور۔ آخر ماسٹر صاحب کو ہماری اس درگت پر رحم آہی گیا۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں پہلے سے آسان سوال لکھوائے۔ جنہیں ہم نے جلدی سے حل کر دیا۔ ایک گھنٹہ کی مسلسل مغز پاشی کے بعد خدا خدا کرکے جان چھوٹی۔ باہر نکلے تو بے ساختہ زبان سے نکلا۔ ع

نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

اس کے بعد ہم باقاعدگی سے پڑھنے کے لئے آتے رہے۔ آہستہ آہستہ پنکھے کا رخ ہماری جانب بھی ہوتا گیا۔ ہم ماسٹر صاحب کی ذرہ نوازی پہ بہت خوش ہوئے کہ چلو انہیں ہمارا بھی خیال آگیا۔ مگر بعد میں جب وہ بالکل ہماری ہی طرف مڑ آیا۔ تو معلوم ہوا کہ بجلی کے مسلسل جھٹکوں نے اسے ہمارا احساس دلایا تھا۔

دن گزرتے گئے حتیٰ کہ امتحان سر پر آ گئے۔ تیاری تو خاک بھی نہ تھی۔ بہر حال اتنا یاد ہے۔ کہ جس دن ریاضی کا پرچہ تھا گھر آئے۔ طبیعت نہایت خراب تھی۔ سیدھے ماسٹر صاحب کے گھر پہنچے اور خوشامد کے علاوہ لڈوؤں کی چاندماری سے ماسٹر صاحب کی روح کو ثواب دارین پہنچایا۔ تب جا کر کہیں ریاضی میں پاس ہوئے لیکن اتنی کوشش کے باوجود ہماری ریاضی کی استعداد دھوبی کے حساب سے نہ بڑھ سکی۔

راجہ خادم حسین عاصم
سال اول

آنسو

اے آنسو کے قطرے تو کبھی بیکار پانی کی طرح چپ چاپ بہ جاتا ہے۔ اس وقت تجھے کوئی نہیں دیکھتا۔ کبھی تیری قدر و منزلت بہترین موتیوں سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اور لوگ تجھ پہ اپنی جان فدا کرنے کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتے ہیں۔ کبھی تجھے دیکھ کر ان کا دل خوف سے لرز جاتا ہے۔ کبھی تو دنیا کی بہترین دولت بن جاتا ہے اور کبھی مہلک ترین زہر۔ اے آنسو! تجھے پانی میں آگ لگانے کا ہنر کس نے سکھایا؟ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے لیکن تو ایسا پانی ہے جو بسا اوقات آگ کو بھڑکا دیتا ہے۔ تو جن سُرخ انگارہ رخساروں پہ بہتا ہے ان انگاروں پہ تیرا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن دیکھنے والے کے دل میں آگ کی آنچ اور تیز ہو جاتی ہے۔ کبھی تو بے چینی، اضطراب، خلش، درد اور چبھن پیدا کرتا اور کبھی تو خوشی سے لبریز ہوتا ہے۔ اور جب تو خدا کے حضور پیش ہوتا ہے تو تجھے دیکھ کر عرش عظیم بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔

"ایک بار کسی بڑے پادری نے اپنے ماتحت پادریوں کو حکم دیا کہ ساٹھ سال سے کم عمر کی عورت نوکر نہ رکھی جائے۔ اس کے کسی ماتحت نے اس کی خلاف ورزی کی اور جب اس سے مواخذہ کیا گیا تو بولا کہ میں نے بہت کوشش کی کہ ساٹھ سال کی کوئی خادمہ ملے۔ لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اس لئے بیس بیس سال کی تین عورتیں رکھ لی ہیں۔"

امتیاز حسین اکرم
سال دوم

یک نہ شد دو شد

آم کا درخت.... جی ہاں آم کا درخت ہمارے گھر لگا ہوا ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ آم کے درخت میں کیا خصوصیت ہوتی ہے۔ آم کے درخت عام ہوتے ہیں۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ لیکن ہمارے گھر میں جو آم کا درخت ہے وہ سب سے انوکھا اور نرالا ہے۔ اگر آپ ہمارے گھر کے ایک فرد ہوتے تو آپ میری بات بلا چوں وچرا تسلیم کر لیتے۔ لیکن آپ ہمارے گھر کے فرد نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کو حق ہے۔ کہ آپ میری بات کو درست تسلیم کریں یا نہ کریں۔ جس دن آم کا درخت ہم نے اپنے گھر میں لگایا تھا۔ سارا گھر خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ میں نے تصور ہی میں آم کے پیڑ پر جھولا ڈالا۔ اور جھولنا شروع کر دیا لیکن جلد ہی کسی نے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ اٹھو! پانی ڈالو۔ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟

بس جناب! یہاں سے ہی میری سرگزشت کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنی میری مصیبتوں کا زمانہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ایک ایسا درد جسے سن کر شاید آپ کی آنکھیں بھی اشکبار ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

جب میں آم کا درخت لگا چکا تو اسے سینچنے کے فرائض بھی مجھے سونپ دیئے گئے۔ پہلے دن تو نیا جوش اور تازہ ولولے تھے۔ اس لئے بغیر کسی تھکاوٹ کے آٹھ دس بالٹیاں ڈال دیں۔ پھر یہ بھی امید تھی کہ شاید آئندہ اس کام سے نجات مل جائے۔ لیکن نہیں جناب! ہر روز صبح و شام پانی ڈالنے کا حکم صادر ہو گیا مرتا کیا نہ کرتا۔ دونوں وقت پانی دیتا۔ لیکن بجائے اس کے کہ مجھے اس جفاکشی پر شاباش ملتی۔ ہمیشہ یہی کہا جاتا رہا۔ کہ میں نے صحیح نیت سے پانی نہیں ڈالا۔ اسی لئے آم سوکھتا جا رہا ہے۔

ایک دفعہ امی کو یا خبر ذرائع سے یہ اطلاع ملی کہ اگر آم کے کملے میں کچی لسی ڈالی جائے۔ تو وہ خوب بڑھتا ہے۔ پس پھر کیا تھا۔ گھر والوں نے اسی دن سے ایک سیر دودھ زیادہ لینا شروع کر دیا۔ تاکہ آم کے اس منحوس پودے کی لسی سے تواضع کی جا سکے۔ خیر مجھے زائد دودھ پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ مجھے تو صرف یہ شکایت ہے کہ جو دودھ مجھے ملتا تھا وہ ازراہ شفقت بند کر دیا گیا۔ کیونکہ بدقسمتی سے سارے گھر میں کمزور اور فرمانبردار یہی خاکسار نابکار واقع ہوا ہے۔ آخر میری محنت رنگ لائی اور آم کے اس پودے نے ایک نئی شاخ نکالی۔ گھر بھر میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ امی نے اپنے ہمسایوں کی عظیم الشان دعوت کی۔ لیکن نحوست نے میرا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ کیونکہ روٹی کم ہو جانے کی وجہ سے مجھے اس رات فاقہ کرنا پڑا۔ ایک دن امی کو کسی نے بتایا کہ اگر آم کے نزدیک کیلے لگا دیئے جائیں۔ تو اس کے دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو آم کو سایہ رہتا ہے۔ دوسرے زمین میں کیلے کی وجہ سے نمی رہتی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ مجھے آواز دی گئی۔ "ارے امتیاز! سنا ہے لوگ کیا کہتے ہیں۔"

"امی جان لوگوں کی تو عادت ہے۔ انہیں کہنے دیجئے۔ وہ تو کہتے رہیں گے"۔ میں نے غصہ میں آ کر بات کاٹ دی۔

"ارے واہ تم کوئی مالی ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ آم کس طرح ہوتا ہے آم کو تو لڑکے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور پھر لڑکے کو پالنا بھی تو بہت مشکل ہوتا ہے"۔ لیکن لڑکے تو پل جاتے ہیں۔ میں نے پھر بات کاٹی۔ "ارے جب تمہارا ہو گا تو پھر معلوم ہو گا"۔ نہ جانے کیوں مجھے اس بات پر شرم آ گئی اور میں نے گردن جھکا لی۔ بہرحال مجھے کیلا لانے کے لئے کہا گیا۔ کیلا کس طرح لا۔ یہ ایک

طویل داستان ہے ۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہے ۔ پہلے تو آم کی حفاظت سے ہی چھٹکارا نہیں مل رہا تھا ۔ اب کیلے کی نگرانی بھی سپرد ہو گئی ہے ۔ نماز بخشوانے گئے تھے ۔ روزے گلے پڑ گئے ۔ اچھا جیسے خدا کی مرضی ؛

ہمارا رزلٹ کارڈ ملاحظہ کیجئے ۔

(ہمارا بھی اب شمار ہو چلا ہے پاس ہونیوالوں میں)

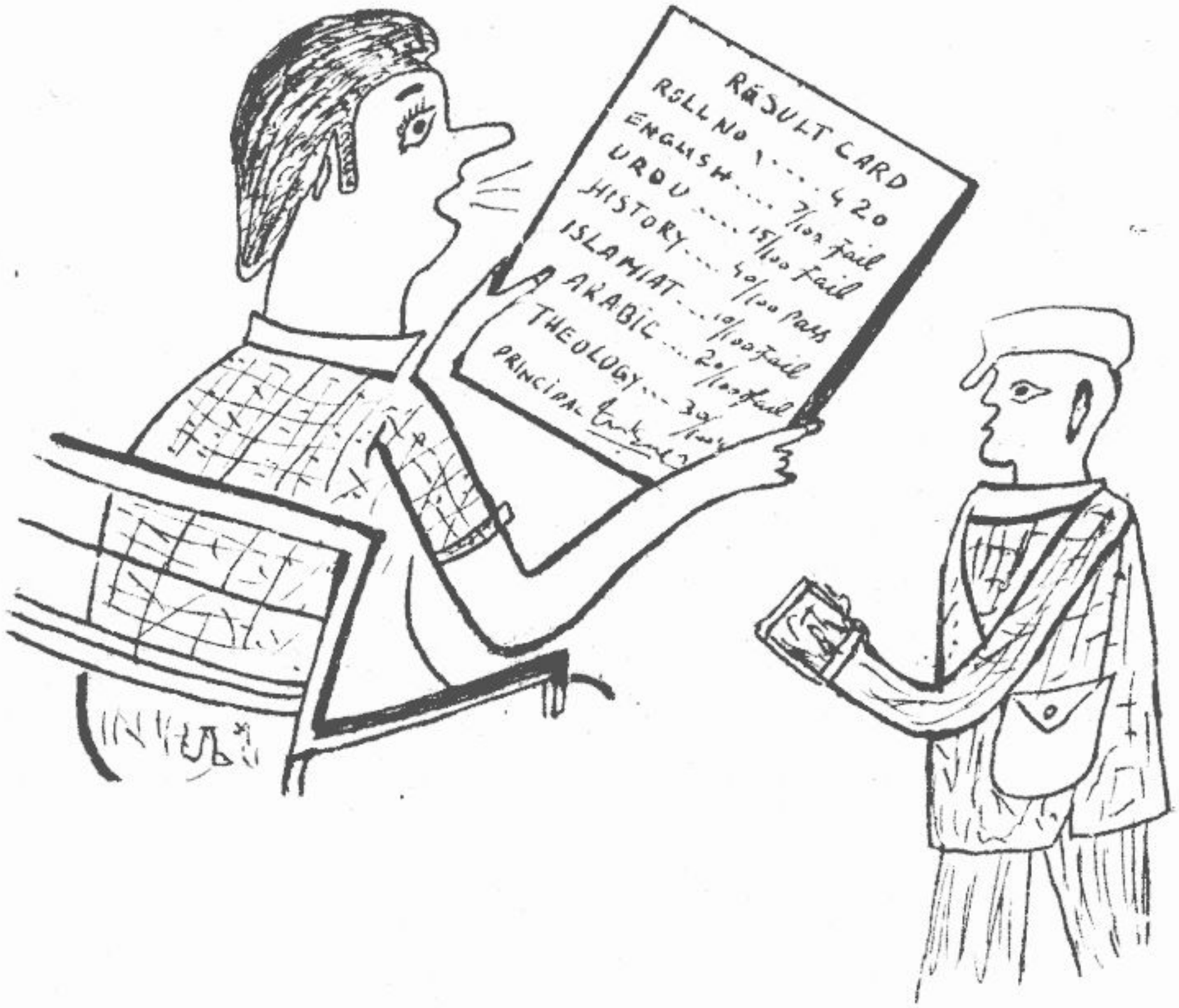

ہیں ! یہ کیا ؟ اس دفعہ تو میں نے گذشتہ ریکارڈ توڑ دیا ہے ۔ یہ تو عجیب بات ہے ۔ کہ خلاف معمول ایک مضمون میں پاس ہو گیا ہوں ۔ خدایا تیرا شکر ہے ۔

(خالد)

Z.A. PRESS · RABWAH.

ادارہ المنار (حصہ اردو)

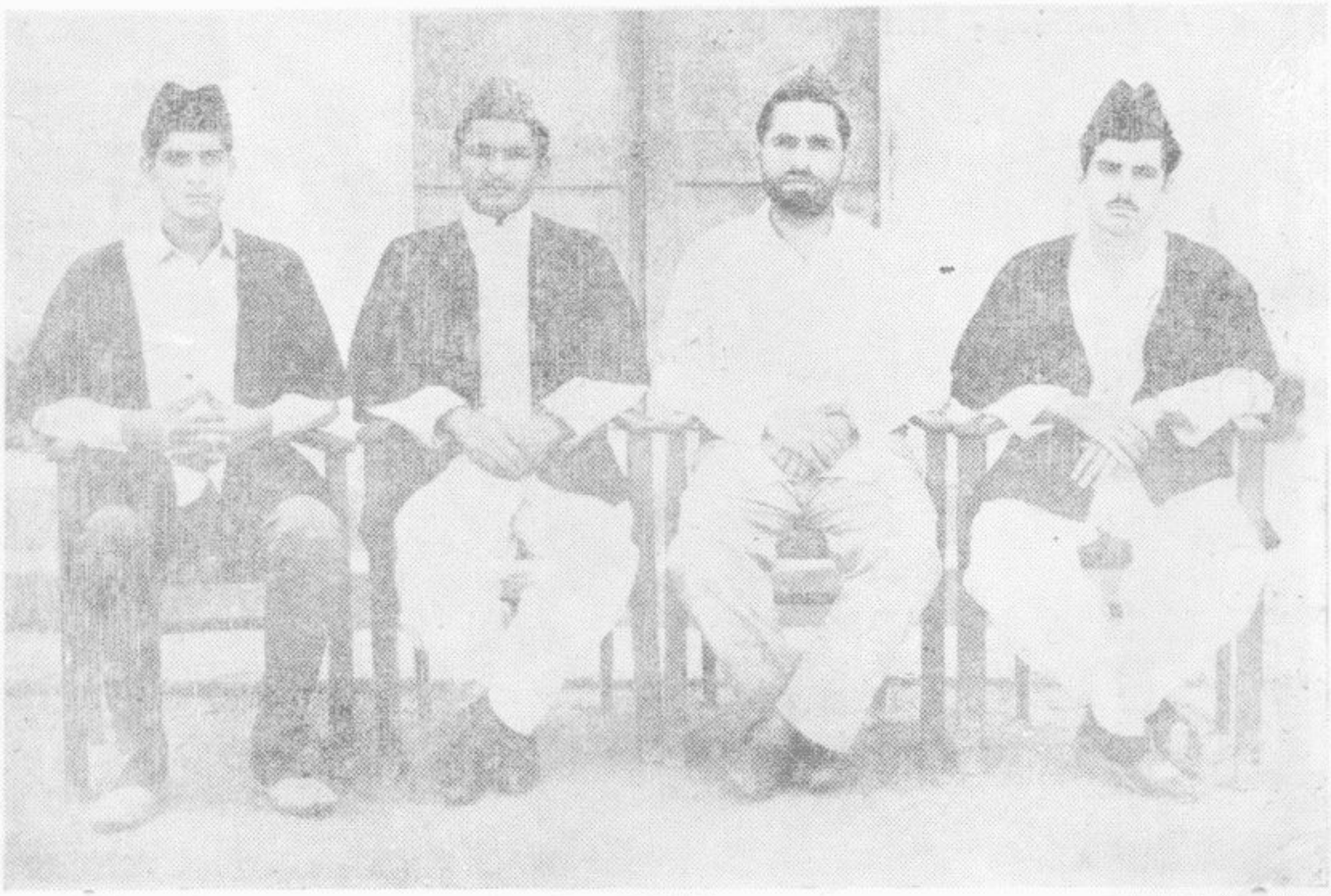

دائیں سے بائیں :- مبارک احمد طاہر (مدیر) پروفیسر رفیق احمد ثاقب ایم ایس سی (نگران)
حافظ عباس علی عاصم (مدیر اعلیٰ) عبدالکریم خالد (نائب مدیر)

AL-MANAR

Shahadat, Hijrat, Ihsan, 1348 H.S.
April, May, June, 1969

Talim-ul-Islam College,
RABWAH

MAGAZINE